(کوثر العلوم)

(زیادت فی العلم کی حقیقت وضرورت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	اہمیت مضمون	۷
۲	طلباء کو متوجہ ہونے کی ضرورت	۹
۳	زیادت فی العلم کی ضرورت	۱۰
۴	علم میں زیادتی کی اقسام	۱۰
۵	وعظ کہنے میں حظ نفس	۱۱
۶	ذکر و شغل میں حظ	۱۱
۷	لذت روحانیہ اور لذت جسمانیہ میں فرق	۱۳
۸	کیفیت روحانیہ کی حقیقت	۱۳
۹	خشوع کی حقیقت	۱۴
۱۰	علاج وساوس	۱۵
۱۱	شبہ کا ازالہ	۱۵

۱۲	منکرین معاد کا رد	۱۶
۱۳	اللہ کے علم وقدرت کا اثبات	۱۸
۱۴	وساوس پر مواخذہ کے شبہ کا سبب	۱۹
۱۵	خوف خدا کا درجہ مطلوب	۲۰
۱۶	صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش آمدہ شبہ کا جواب	۲۱
۱۷	شبہ کا ازالہ	۲۲
۱۸	طلبائے فارغین کے علوم کا حال	۲۳
۱۹	نسبت کی حقیقت	۲۵
۲۰	صوفیاء کا اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے کی مثال	۲۵
۲۱	ذاکر کون؟	۲۶
۲۲	اجرت اور نفقہ میں فرق کا معیار	۲۷
۲۳	علم میں ترقی کی ضرورت	۲۹
۲۴	ہدایت اور علم میں تعلق	۳۰
۲۵	''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کے معنی	۳۱
۱۶	اشکالات کے جوابات	۳۲
۲۷	''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ج فِيْهِ'' پر وارد شبہ کا جواب	۳۳

۲۸	اسباب زیادت علم	۳۴
۲۹	علم کی حقیقت	۳۵
۳۰	من گھڑت حکایت	۳۵
۳۱	حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادت علم کی حقیقت	۳۶
۳۲	دین کی سمجھ ہی حقیقت علم ہے	۳۷
۳۳	ذوقیات کو سمجھنے کا طریقہ	۳۹
۳۴	ذوقیات کو الفاظ سے سمجھنے کا انجام	۴۱
۳۵	کثرت معلومات اور علم میں فرق	۴۲
۳۶	حقیقت علم کے حصول کے اسباب	۴۴
۳۷	تقویٰ کی حقیقت	۴۴
۳۸	تقویٰ کی ایک مثال	۴۷
۳۹	طلباء میں تقویٰ کی کمی کا سبب	۴۷
۴۰	طلباء میں موجود کوتاہیاں	۴۸
۴۱	مولانا قاسم نانوتویؒ اور اساتذہ کا ادب	۴۹
۴۲	علماء کا ادب کرنے کی اہمیت	۵۰
۴۳	حصول تقویٰ کا گر	۵۱

۴۴	علوم مقصودہ و غیر مقصودہ کی تفصیل	۵۱
۴۵	علوم اسرار اور علوم انوار	۵۲
۴۶	علم محکم و علم متشابہ	۵۴
۴۷	تتمہ وعظ	۵۵

وعظ

(کوثر العلوم)

(زیادت فی العلم کی حقیقت وضرورت)

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے یہ وعظ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں شب جمعہ ۷/محرم الحرام ۱۳۴۰ھ کو دو گھنٹے تیس منٹ تک کھڑے ہوکر طلباء واہل مدرسہ کی درخواست پر ارشاد فرمایا۔

زیادت فی العلم کے مطلوب ہونے کو تفصیل سے بیان کیا اس وعظ کے مضامین عجیب وغریب ہیں اور اہل علم کے لئے نہایت مفید ہیں بعض علمی اور دقیق مسائل کو حضرت نے قلم بند فرما کر بعد میں ناقل وعظ علامہ ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ کو دیا جن کو انہوں نے بالفاظ اختتام وعظ پر نقل کردیا سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی علم کے خیر کثیر ہونے کی مناسبت سے اس وعظ کا نام کوثر العلوم رکھا گیا۔ طلباء اور علماء کے لئے انتہائی مفید ہے۔ عوام کو اگر درمیان وعظ کچھ دقیق مضامین سمجھ میں نہ آئیں تو پریشان نہ ہوں ان کو علماء کے لئے سمجھیں اور باقی مضامین سے مستفید ہوں۔ حضرت کے مخاطب چونکہ عوام اور علماء سب لوگ ہیں اس لئے بیان وعظ میں سب کی رعایت ہے ۱۲۔

خلیل احمد تھانوی

۹ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۤ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾(۱)

اہمیت مضمون

میں اس وقت ان آیتوں سے ایک ضروری مضمون کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا تعلق خصوصیت کے ساتھ اہل علم سے ہے بالخصوص طلبہ کو اس کی زیادہ

(۱) ’’الم۔ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جاچکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب‘‘ سورہ بقرہ:۱۔۵ معارف القرآن:۱/۱۰۶۔

ضرورت ہے۔ چونکہ داعی اس وقت طلبہ ہی ہیں اس لئے ان کے مناسب مضمون بیان کرنا ضروری ہے اگرچہ ایک درجہ میں وہ مضمون عام بھی ہے اور سب مسلمانوں کی ضرورت کا ہے کیونکہ ہر مسلمان ہر وقت مسلمان ہونے کی حیثیت سے طالب علم ہے کیونکہ ایک درجہ طلب علم کا ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہ ضروریات کا علم ہے یعنی بقدر ضرورت عقائد کا اور احکام صلوٰۃ وصوم (۱) واحکام معاملات ومعاشرات کا علم ہر مسلمان پر لازم ہے (طلب العلم فریضة علی کل مسلم الحدیث ۱۲)(۲) نیز اس کی بھی ضرورت ہے کہ دین اور علم دین سے مناسبت پیدا کرے اور دین کی سمجھ حاصل کرے اور فہم کو بڑھائے اور اسی کا نام طالب علمی ہے (الحکمة ضالة المؤمن فحیث وجدها فهوا حق بها۔ الحدیث)(۳) پس جب یہ مضمون طلبہ کی ضرورت کا ہے تو گویا ہر مسلمان کی ضرورت کا ہے کیونکہ ثابت ہو چکا کہ ہر مسلمان طالب علم ہے مگر کلی مشکک کی طرح اس وصف کا صدق بعض پر زیادہ ہے اور بعض پر کم (۴) جو لوگ سارے مشاغل کو چھوڑ کر طلب علم ہی میں مشغول ہیں ان پر یہ وصف زیادہ صادق آتا ہے اور اسی وجہ سے عرفاً طالب علم کے لفظ سے متبادر الی الذهن (۵) وہی ہوتے ہیں باقی مطلق طلب علم سے کوئی مسلمان بھی خالی نہیں پس اس درجہ میں (یعنی درجہ اطلاق میں) یہ مضمون سب کے مناسب ہے یہ میں نے اس لئے عرض کر دیا کہ جو لوگ عرفی طلبہ نہیں ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ مضمون ہماری ضرورت کا نہیں ہے کیونکہ اس سمجھنے کے دو اثر ہوتے جو لوگ ان میں سے طالب ہوتے وہ تو حسرت کرتے اور جو غیر طالب ہوتے وہ آزاد ہو جاتے کہ بس ہم کو بے فکر ہو کر بیٹھنا چاہیئے ہم اس بیان کے مخاطب ہی نہیں۔

(۱) نماز روزہ کے احکام (۲) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے (۳) حکمت مسلمان کی گمشدہ چیز ہے اس کو جہاں پائے مسلمان اس کا زیادہ حق دار ہے (۴) بعض لوگوں میں یہ صفت زیادہ پائی جاتی ہے بعض میں کم (۵) لفظ طالب علم سنکر اولاً ذہن ان ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

مختلف طبائع پر اسخیال کا مختلف اثر ہوتا ہے اس لئے میں نے کہہ دیا کہ فی نفسہ یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے۔

طلباء کو متوجہ ہونے کی ضرورت

البتہ طلبہ کے ساتھ زیادہ تعلق ہے اور ان کو اس کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے ایک تو اس لئے کہ طالب علم کا صدق ان پر (۱) دوسروں سے زیادہ ہے دوسرے اس لئے کہ یہ مقتدیٰ (۲) بننے والے ہیں ان کو اپنے فرائض منصبی کے جاننے کی زیادہ ضرورت ہے اگر ان میں خدانخواستہ کمی رہ گئی تو دوسروں کو ضرر ہوگا کیونکہ یہی مبلغ احکام ہوں گے، دوسرے لوگ جب کسی حکم کے متعلق ان میں کمی دیکھیں گے تو ان کا یہ اعتقاد ہو جائیگا کہ جب مبلغ ہی کو اسکا اہتمام نہیں تو یہ کوئی ضروری چیز نہیں ہوگی بعض کا تو سچ مچ یہ اعتقاد ہی ہو جاتا ہے وہ احکام سے جان چرانے کے لئے بہانہ نہیں کرتے اور جو بہانہ باز ہیں ان کو علماء کے عدم اہتمام سے گو اعتقادی ضرر نہ ہو (۳) کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حکم سب کے لئے عام ہے مگر الزام سے بچنے کے لئے ان کو موقع ہاتھ آجاتا ہے اب کوئی ان کو امر بالمعروف کرے (۴) تو وہ دلیری سے جواب دیتے ہیں کہ میاں اس میں تو مولوی بھی کوتاہی کرتے ہیں اور ہم تو پہلے ہی سے دنیا دار ہیں اب وہ پہلے سے زیادہ کوتاہی کرنے لگتے ہیں جس کا سبب یہ عالم اور مبلغ بنتا ہے اس لئے طلبہ کو اس مضمون کے ساتھ زیادہ تعلق ہے ان کو اس طرف زیادہ توجہ کرنا چاہیئے۔ غرض اس مضمون کا تعلق طلبہ سے اولاً و بالاولیٰ ہے (۵) اور دوسروں سے ثانیاً اور بعد کے درجہ میں ہے اس مضمون کی تعیین کرتا ہوں پھر اس کی تفصیل کردی جائے گی۔

---

(۱) طالب علم ہونا ان پر زیادہ صادق آتا ہے (۲) راہنما (۳) عقیدہ خراب نہ ہو (۴) اچھے کام کرنے کو کہے (۵) سب سے پہلے اور سب سے زیادہ۔

زیادت فی العلم کی ضرورت

وہ مضمون یہ ہے کہ زیادت فی العلم مطلوب ہے (۱) یعنی علم تو مطلوب ہے ہی۔ چنانچہ آیات واحادیث میں بکثرت اس کی تصریح ہے جس کو اہل علم جانتے ہیں اس وقت مجھے ان کے بیان کی ضرورت نہیں اس وقت میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس طرح مطلق علم مطلوب ہے اسی طرح اس کی ترقی اور زیادت بھی مطلوب ہے شاید بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ اس کے بیان کی بھی کیا ضرورت ہے اس پر تو ہمارا پہلے سے خود ہی عمل ہے کیونکہ ہم کتابیں پڑھتے چلے جاتے ہیں اور ہر فن میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد کتابیں پڑھتے ہیں تو ہم زیادت فی العلم پر خود ہی عامل ہیں اور اس کو مطلوب بھی سمجھتے ہیں مطلوب نہ سمجھتے تو عمل کیوں کرتے۔

علم میں زیادتی کی اقسام

اس کا اصلی جواب تو یہ ہے کہ زیادت علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زیادت صورت علم کے متعلق ہے ایک حقیقت علم کے متعلق۔ اور جس زیادت پر آپ کا عمل ہے وہ صورت علم کی ترقی ہے حقیقت علم کی ترقی نہیں ہے کیونکہ کتابیں زیادہ پڑھنے سے حقیقت علم کی زیادت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے دوسرے اسباب ہیں جو آئندہ معلوم ہوں گے جن سے آپ کو بے توجہی ہے اس لئے یہ سوال متوجہ ہی نہیں ہوتا لیکن میں تبرعاً سوال کو وارد (۲) مان کر جواب دیتا ہوں کہ جس چیز کو آپ زیادت فی العلم سمجھے ہوئے ہیں وہ زیادت نہیں ہے کیونکہ آپ نے زیادت فی العلم کو ایک مقدار محدود میں منحصر کرلیا ہے حالانکہ زیادت کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ وہ ایک غیر متناہی چیز ہے (۳)

(۱) علم میں زیادتی (۲) لیکن استحساناً سوال کو قائم کر کے جواب دیتا ہوں (۳) جس کی کوئی حد نہیں۔

نہ بمعنی غیر متناہی بالفعل جس کا وجود محال ہو بلکہ بمعنی لا تقف عند حد (۱) اب غور کیجئے کہ کتابیں پڑھنے پڑھانے سے آپ کو کونسی زیادت مطلوب ہے۔ ظاہر ہے کہ نصاب کی حد تک ترقی مطلوب ہے اس کے بعد اکثر لوگ بے فکر ہی نہیں بلکہ اپنے کو صاحب کمال یعنی مستغنی عن الطلب (۲) سمجھنے لگتے ہیں اس کے بعد زیادت فی العلم میں کون مشغول ہوتا ہے درسیات سے فارغ ہونے کے بعد حالت یہ ہے کہ جن کی استعداد خراب ہے وہ تو پڑھنا پڑھانا ہی چھوڑ دیتے ہیں پھر بعض تو ذکر و شغل میں مشغول ہو جاتے ہیں اور بعض وعظ گوئی اختیار کر لیتے ہیں۔

وعظ کہنے میں حظ نفس

کیونکہ ان میں حظِّ نفس ہے (۳) ایک میں حظ نفسانی بواسطہ حظ جسمانی کے ہے اور ایک میں حظ نفسانی بلا واسطہ حظ جسمانی کے ہے (۴) وعظ میں تو حظ نفسانی بواسطۂ جسمانی کے ہے کہ لوگ واعظ کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں جسمانی اور مالی خدمت کرتے ہیں عمدہ عمدہ غذائیں کھانے کو ملتی ہیں اور قیمتی سواری ملتی ہے کہیں موٹر کہیں فٹن (۵) کہیں فسٹ کلاس کا درجہ۔

ذکر و شغل میں حظ

اور ذکر و شغل میں حظ نفسانی بلا واسطہ جسمانی کے ہے کیونکہ بعض لوگ ذکر و شغل میں اس لئے مشغول ہوتے ہیں کہ ان کو جاہ مطلوب ہے کہ صوفی اور بزرگ بن کر ملک القلوب (۶) حاصل ہو جائے یہ تو حظ نفس ہے اور حظ جسمانی کا واسطہ اس میں اس

(۱) ایسا فعل کہ جس کی کوئی انتہاء نہ ہو یہ تو ناممکن ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکی کسی حد پر آدمی نہ رکے بلکہ مزید علم حاصل کرتا ہے (۲) طلب علم سے بے نیاز (۳) نفس کو مزہ آتا ہے (۴) ایک لذت بواسطہ جسم کے ہے ایک میں بلا واسطہ جسم کے (۵) ایک قسم کی چہار پہیوں کی بگھی جس میں سواری کی جاتی تھی (۶) لوگوں کے دلوں کے مالک ہو جائیں۔

لئے نہیں ہے کہ ذکر و شغل میں مشغول ہونے کے ساتھ ان کو مجاہدات کرنا پڑتے ہیں تقلیل طعام و تقلیل منام کرنا پڑتی ہے (۱) بلکہ بعض تو جاہ حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ تکالیف جسمانیہ برداشت کرتے ہیں کہ ایک ہی وقت کھانا کھاتے اور موٹا کپڑا پہنتے ہیں تاکہ لوگ ان کو تارک اور زاہد سمجھیں یہ تو غیر مخلصین کا حال ہے۔ اور جو مخلص ہیں وہ حظ نفس (۲) کے طالب تو نہیں مگر حظ نفس سے خالی وہ بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ذکرو شغل میں بعض ایسی چیزوں کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں جو واقع میں مقصود نہیں بلکہ حظوظ نفس میں داخل ہیں گو یہ مخلصین ان کو حظوظ نفس نہیں سمجھتے مگر چونکہ واقع میں وہ حظوظ نفس ہیں اور یہ اُن کے طالب ہیں اس لئے من حیث لا یدری (۳) یہ بھی طالب حظ نفس ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ذکرو شغل میں جو لذت آتی ہے اکثر ذاکرین اس لذت کے طالب ہیں اور اس کو لذت روحانی سمجھ کر مقصود سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ وہ لذت اکثر نفسانی ہوتی ہے اور گو یہ لذت بھی مضر نہ ہو بلکہ کسی درجہ میں محمود ہی سہی مگر مقصود بھی نہیں کیونکہ محمود ہونا یعنی نفسانی مقصود ہونے کو مستلزم نہیں (۴)۔ اور اکثر ذاکرین اس کو مطلوب سمجھے ہوئے ہیں ان کو محض رضاء الٰہی و ذکر حق بہت کم مطلوب ہوتا ہے بلکہ زیادہ تر یہ حظ نفس مطلوب ہے چنانچہ یہ حظوظ نفسانیہ اگر مقصود نہ ہوتے تو سالکین وذاکرین وہ شکایتیں نہ کرتے جو شیوخ سے آجکل کی جاتی ہیں اگر ان کو محض رضا و ذکر حق مطلوب ہوتا تو یہ تو ان کو عدم لذت کی حالت میں بھی حاصل ہے (۵) پھر شکایت کس چیز کی ہے آخر لذت کے نہ ہونے سے مقصود میں کیا کمی آگئی جو اس کی شکایت کی جاتی ہے کیا کسی نص سے یہ ثابت ہے کہ عدم لذت منقص اجر ہے (۶) ظاہر ہے کہ کسی نص سے یہ

(۱) کم کھانا اور کم سونا پڑتا ہے (۲) نفسانی لذتیں (۳) نامعلوم طریقے پر یہ بھی لذت نفس کے طالب ہوتے ہیں (۴) کس چیز کے اچھے ہونے کا یہ مطلب نہیں اس کو مقصود بنالیا جائے (۵) اگر اللہ کی خوشنودی اور اس کا ذکر ہی مطلوب ہوتا تو وہ بغیر لذت کے بھی حاصل ہے (۶) ذکر میں لذت کا نہ ہونا ثواب کو کم کرنے والا ہے۔

بات ثابت نہیں پھر اس کے نہ ہونے سے رنج و ملال اور شیخ سے شکوہ و شکایت کیوں؟ معلوم ہوا کہ یہ لوگ مقصود بالغیر کو مقصود بالذات اور مقصود بالذات کو مقصود بالغیر سمجھتے ہیں جبھی تو لذت کی کمی سے کام میں کمی کر دیتے ہیں۔

لذت روحانیہ اور لذت جسمانیہ میں فرق

اب میں لذت روحانیہ اور لذت نفسانیہ میں فرق بتلاتا ہوں تاکہ ذاکرین دھوکہ سے بچتے رہیں اور حظوظ نفس کے طالب نہ ہوں۔(۱) یاد رکھو ذکر و شغل اور نماز وغیرہ سے جو روح کو کیفیات حاصل ہوتی ہیں وہ نہایت لطیف ہوتی ہیں کہ لطافت کی وجہ سے ان کو کیفیت کہنا بھی مشکل ہے وہ غلبہ کے ساتھ وارد نہیں ہوتیں اور ان کی علامت یہ ہے کہ یوماً فیوماً (۲) ان میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور کیفیات نفسانیہ کا ورود غلبہ سے ہوتا ہے (۳) جن میں بعض دفعہ حدود شرعیہ سے بھی انسان نکل جاتا ہے گو یہ اس میں مجبور و معذور ہو مگر یہ کیفیت مطلوب و مقصود نہیں اور نہ اُن کے لئے بقاء ہے بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غلبہ جاتا رہتا ہے۔

کیفیت روحانیہ کی حقیقت

کیفیت روحانیہ اور لذت روحانیہ کی حقیقت وہ ہے جس کو ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے: (جعلت قرة عینی فی الصّلوٰة) "کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۱۲)"

اس کی حقیقت تو وہی جانتا ہے جس کو یہ ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے مگر اس کی علامت یہ ہے کہ نماز سکون و اطمینان سے ادا کرے جلدی نہ کرے اور کوئی چیز اس کو نماز سے مشغول نہ کرے یعنی نماز سے روکنے والی کوئی چیز نہ ہو اور بدوں نماز

(۱) نفسانی لذتوں کے طالب نہ ہوں (۲) روز بروز (۳) نفسانی کیفیت عام طور پر غلبہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔

کے قلب کو چین نہ ملے (۱) وقت آتے ہی نماز کے لئے دل بے چین ہو جائے اسی کو خلوص اور احسان کہتے ہیں یہ ہیں کیفیات روحانیہ بخلاف ان کیفیات کے جو سالکین کو وسط میں پیش آتی ہیں جیسے محویت اور استغراق وغیرہ۔ ان کا بعض اوقات ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ حدود سے بھی نکل جاتا ہے سو یہ کیفیات مقصود نہیں اور جس کو خلوص حاصل ہو جو کہ کیفیت روحانیہ ہے گو اس کو کتنے وساوس آتے ہوں اس حالت میں بھی اسکا طالب لذت ومحویت ہونا ایسا ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں ؎

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ پائے بوسی اندراں دم شد گناہ

''یعنی جس کو بادشاہ نے اپنے ہاتھ چومنے کا موقعہ دے دیا ہو اُس کا یہ کہنا کہ نہیں حضور میں تو پیر ہی چوموں گا خطا ہے اور گناہ ہے ۱۲''

یہ لذت اور محویت تو پائے بوسی (۲) کے مثل ہے اور خلوص واحسان دست بوسی (۳) کے مثل ہے پھر افضل کو چھوڑ کر مفضول کا طالب ہونا غلطی ہے یا نہیں اور محویت واستغراق (۴) کے غیر مقصود ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نصوص میں اس کی فضیلت کہیں وارد نہیں ہوئی۔

خشوع کی حقیقت

بلکہ حدیث میں تو خشوع کی یہ حقیقت بتلائی گئی ہے: (من توضّاء فاحسن الوضؤ ثم صلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبه لا یحدث فیھما نفسه غفرلھا تقدم من ذنبه او کماقال) ''جس نے وضو کیا اور اچھی طرح کیا پھر دو رکعت اس طرح پڑھے کہ دل سے ان پر متوجہ ہو اور ان میں اپنے نفس سے باتیں نہ کرے وہ جنت میں

(۱) بغیر نماز پڑھے دل کو سکون نہ ہو (۲) قدم چومنے کی طرح (۳) ہاتھ چومنے کی طرح (۴) سکر اور بے خودی کی سی کیفیت ہو جانے کے مقصود نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شریعت میں اس کی کہیں فضیلت نہیں آئی۔

داخل ہوگا ۱۲''

حضور نے یہ نہیں فرمایا: (لا تتحدث فیهما نفسه) ''کہ اسکا دل بھی باتیں نہ کرے'' بلکہ (لا یحدث فیهما نفسه) فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے وساوس نہ لاوے گو خود آجاویں اسکا مضائقہ نہیں اور جب وسوسہ کا آنا مذموم نہیں (۱) تو اسکا نہ آنا مطلوب بھی نہیں ہاں وسوسہ کا ازخود لانا مذموم ہے (۲) اور ازخود نہ لانا مطلوب ہے (۳) پس جو خود وسوسہ نہ لاتا ہو اسکو مطلوب حاصل ہے اب اس کا یہ چاہنا کہ بلاقصد بھی وساوس نہ آیا کریں غیر مقصود کی طلب ہے۔

علاجِ وساوس

احادیث میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا وسوسہ کی شکایت کرنا وارد ہے جس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو کوئی ایسا وظیفہ نہیں بتلایا جس سے وساوس کا آنا بند ہوجاوے بلکہ حضور نے عدم التفات کا امر فرمایا ہے: (بقوله ذلك صريح الايمان وبقوله فليستعذ بالله (۴) ولينته) جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے کو ذکر کی طرف متوجہ کردے اور وسوسہ کی طرف التفات نہ کرے یعنی ازخود اس طرف متوجہ نہ ہو یہی مفہوم ہے لینته کا، نہ یہ کہ اسکی نفی کی طرف متوجہ ہو۔اس سے صاف معلوم ہوا کہ وساوس کا نہ آنا مطلوب نہیں، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی مطلوبیت کو ظاہر فرماتے۔

شبہ کا ازالہ

شاید اس پر کوئی یہ شبہ کرے کہ گو احادیث سے وسوسہ پر مواخذہ نہ ہونا (۵) معلوم ہوتا ہو مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وسوسہ پر بھی مواخذہ ہے چنانچہ حق تعالیٰ

(۱) برا نہیں (۲) خود سے وسوسہ لانا برا ہے (۳) خود سے نہ لانا مقصود ہے (۴) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد کہ یہی صریح علامت ایمان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پس اللہ سے پناہ چاہو خود سے اس کی طرف متوجہ نہ ہو (۵) پکڑ نہ ہونا۔

فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾(۱) اس سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ وسوسہ پر مواخذہ ہے چنانچہ بہت آیتوں میں ﴿یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾(۲) وغیرہ عنوانات کی دلالت اس پر متفق علیہ ہے۔ مگر اس شبہ کا منشاء عدم تدبر ہے(۳) اور قرآن میں اکثر اشکالات جو پیش آتے ہیں وہ سیاق وسباق میں غور نہ کرنے ہی سے وارد ہوتے ہیں ورنہ قرآن کے مضامین پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوسکتا واقعی ﴿بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ﴾(۴) ہے مگر کس کے لئے؟ تدبر کرنے والوں کے لئے ﴿کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ﴾(۵) اب سنئے کہ ﴿نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾(۶) سے یہ اشکال کیوں پیدا ہوا؟ منشا اشکال کا یہ ہے کہ لوگوں نے اس کو عتاب پر محمول کیا ہے کہ گویا حق تعالیٰ یوں فرمارہے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے وساوس قلبیہ کو خوب جانتے ہیں اس لئے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ان وساوس کی کسی کو خبر نہیں جیسے (نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ اور نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ) وغیرہ میں عتاب ہے مگر سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ کو عتاب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہاں خالقیت سے عالمیت پر استدلال کرنا مقصود ہے جیسا کہ دوسری جگہ بھی ایک آیت میں خالقیت سے عالمیت پر استدلال فرمایا ہے: ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾ کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ بھی اپنی مخلوق کو نہ جانے گا حالانکہ وہ بہت باریک بیں اور صاحب علم ہے) یہی مضمون یہاں مذکور ہے۔

منکرین معاد کا رد

چنانچہ سیاق وسباق میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجائیگی کہ سباق میں تو

---

(۱) ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے نفس میں جو وساوس آتے ہیں ہمیں معلوم ہیں (۲) جو تم کرتے ہو اللہ کو معلوم ہے (۳) غور نہ کرنا ہے (۴) ہدایات کو بیان کرنے والی کتاب ہے (۵) اللہ تعالیٰ نے یہ مبارک آیات اتاری ہیں تا کہ ان میں غور کریں (۶) ان کے نفس میں جو خیال آتا ہے ہم اس کو جانتے ہیں۔

ابتدائے سورت سے تامل کیا جائے (۱) تو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ اس مقام پر منکرین معاد (۲) پر رد کرنے کے لئے معاد کو (۳) ثابت فرمارہے ہیں اور معاد کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو قدرت کاملہ کی جس سے نیست کو ہست کرنے پر خدا تعالیٰ قادر ہوں۔ دوسرے علم کامل کی جس سے موت اجسام کے بعد اس کے اجزاء متفرقہ کا جمع کرنا ممکن ہو۔ (۴) چنانچہ اول حق تعالیٰ نے منکرین معاد کا قول نقل فرمایا کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کو عجیب اور بعید سمجھتے ہیں ذلك رجعٌ بعید (۵) اس کے بعد اس تعجب اور بعد کو دفع کرنے کے لئے اپنے لئے علم کامل کا دعوی کیا ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ﴾ جس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی کھاتی اور) کم کرتی ہے اور (یہی نہیں کہ ہم آج سے جانتے ہیں بلکہ ہمارا علم قدیم ہے حتی کہ ہم نے قبل وقوع ہی (۶) سب اشیاء کے تمام تر حالات اپنے علم قدیم سے ایک کتاب میں جو لوح محفوظ کہلاتی ہیں لکھ دی تھی اور اب تک) ہمارے پاس (وہ) کتاب محفوظ (موجود) ہے جس میں ان اجزاء مستحیلیہ کی وضع (۷) اور کیفیت اور مکان اور مقدار وغیرہ سب کچھ ہے) اس کے بعد اپنی قدرت کاملہ ثابت کرنے کے لئے آسمان وزمین کی پیدائش اور بارش وغیرہ کا تذکرہ فرمایا کہ ہم نے کس طرح خوبصورتی اور مضبوطی کے ساتھ آسمان کو بنایا ہے جس میں باوجود امتداد زمانہ کے کوئی بھی رخنہ نہیں (۸) اور زمین کو کیسا بچھایا ہے اور

(۱) غور کیا جائے (۲) آخرت کے منکرین (۳) آخرت (۴) جسموں کے مرجانے کے بعد ان کے متفرق اجزاء کو جمع کرنا (۵) مرنے کے بعد زندہ ہونے کو ناممکن خیال کرتے ہیں (۶) اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سے (۷) جسم انسانی کے وہ اجزاء جو تخلیل ہو کر زمین کا جز بن جاتے ہیں (۸) اتنا طویل زمانہ گذرنے کے باوجود کوئی خرابی نہیں واقع ہوئی۔

اس میں پہاڑوں کو جمایا اور ہر قسم کی خوشنما چیزیں اُگائیں اور آسمان سے برکت کا پانی نازل کیا جس سے باغ اُگائے اور غلہ اور کھجور کے درخت پیدا کیے جس سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے بس سمجھ لو کہ اسی طرح مردہ اجسام بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں افعیینا بالخلق الاول کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے (جو دوبارہ زندہ نہ کر سکیں یہ بھی غلط ہے کیونکہ تعب تو نقص قدرت کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی قدرت ناقص نہیں بلکہ غایت درجہ کامل ہے جس پر مخلوقات خود شاہد ہیں تو وہ تعب سے بھی بری ہیں یہاں تک تو قدرت کا اثبات ہوا۔

اللہ کے علم وقدرت کا اثبات

آگے علم کامل پر (جس کا اول دعویٰ کیا گیا تھا خالقیت سے استدلال فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾ یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو غایت درجہ علم وحکمت اور قدرت کی دلیل ہے کیونکہ انسان تمام مخلوق میں سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار اور ذی علم ہے تو سمجھ لو کہ اسکا پیدا کرنے والا کیسا ذی علم ہوگا) اور ہم ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جو اسکے نفس میں بطور وسوسہ کے گزرتی ہیں (کیونکہ اسکا منشا حرکت قلب ہے اور اس حرکت کو بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں یہ وساوس نہیں ہیں تو جو وساوس کو بھی جانتا ہے جن کا قیام بھی قلب میں نہیں ہوتا (۱) وہ انسان کے ارادہ اور عزم کو کیوں نہ جانے گا جس کو قلب میں قیام ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اعمال جوارح واقوال لسان کو کیوں نہ جانے گا (۲) جو سب کو محسوس ہوتے ہیں گو بوجہ عرض ہونے کے ان کو خود قیام نہیں (۳) مگر پھر بھی تبعا للذات انکا ادراک مخلوق کو بھی ہوتا ہے تو خالق کو کیوں نہ ہوگا

(۱) جو دل میں ٹھہرتے بھی نہیں (۲) اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال اور زبان سے نکلنے والے الفاظ کو کیوں نہیں جانے گا (۳) اگر چہ وہ الفاظ خود قائم نہیں رہتے کہ زبان سے بات نکلی اور معدوم ہوئی۔

اور جب وہ وساوس قلب اور ارادہ وعزم اور افعال واقوال کو جانتا ہے تو اجزء مستحیلہ متفرقہ (۱) کو جو جواہر واعیان ہیں کیوں نہ جانے گا) یہ تو سباق کی دلالت تھی اس استدلال پر آگے سیاق تو بہت ہی صریح ہے فرماتے ہیں ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ کہ ہم باعتبار علم کے اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (رگ سے مراد یہاں پر وہ رگ ہے جس کا اتصال شرط حیٰوۃ ہے اور حیات کا مدار نفس وروح ہے مقصود یہ ہے کہ ہم انسان کے نفس وروح سے بھی زیادہ اس کے احوال کو جانتے ہیں کیونکہ ہمارا علم قدیم ہے اور حضوری اور انسان کے نفس وروح کا علم حادث (۲) ہے خواہ حضوری ہو یا حصولی اور حصولی تو فی نفسہ بھی ناقص ہے۱۲) علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں اقربیت سے اقربیت بالعلم مراد ہے (۳) پس ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ یہاں ایسا ہے جیسا ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ﴾ کے بعد ﴿ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ تھا حاصل دونوں کا ایک ہے کہ خالقیت سے عالمیت پر استدلال (۴) کیا گیا ہے اور علم الٰہی کا کمال ثابت کیا گیا ہے جس سے امکان معاد کو ثابت کر کے استبعاد کو رفع کرنا مقصود ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان وساوس پر مواخذہ ہوگا یا نہیں بلکہ صرف علم وساوس سے کمال علم کو ثابت کرنا مقصود ہے خوب سمجھ لو پس اس آیت سے وساوس پر مواخذہ کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

وساوس پر مواخذہ کے شبہ کا سبب

جس آیت سے اول نظر میں وساوس پر مواخذہ کا شبہ ہوسکتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو بہت صاف اور صریح طور پر دفع فرما دیا ہے اور وہ آیت ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ''اور اگر تم ظاہر کرو ان باتوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں

(۱) انسان کے وہ اجزاء جو مرنے کے بعد زمین میں تحلیل ہوگئے ہیں ان کو کیوں نہیں جانے گا (۲) بعد میں پیدا ہوا (۳) علم کے اعتبار سے قرب مراد ہے (۴) اللہ کے خالق ہونے سے عالم ہونے پر دلیل پکڑی ہے۔

یا چھپاؤ بہرحال اللہ تعالیٰ تم سے ان کا محاسبہ فرمائیں گے پھر جس کو چاہیں گے معاف کردیں گے اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے اور اللہ تعالیٰ کو ہر بات پر قدرت ہے)

یہاں بظاہر لفظ ''ما'' عام ہے وساوس غیر اختیاریہ اور خیالات اختیاریہ سب کو اور عموم ہی کی وجہ سے صحابہ کو اشکال ہوا تھا مگر اس کا منشا عدم علم نہ تھا صحابہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے کیونکہ یہ مسئلہ عقلیہ بھی ہے بلکہ غلبۂ خشیت سے ان کو عموم کا شبہ ہوا(۱) کیونکہ لفظ بظاہر عام تھا اور خشیت وہ چیز ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت علم پر نظر نہیں رہتی بلکہ علم مغلوب ہوجاتا ہے۔

خوف خدا کا درجہ مطلوب

قربان جایئے حضور ﷺ کے کہ آپ نے خشیت کی بھی ایک حد بیان فرمادی حضور کے سوا اس کو کوئی نہیں بیان کرسکتا ہم تو خشیت کے ہر درجہ کو مطلوب سمجھتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ سے ڈرنا محمود اور مقصود ہے(۲) اور مقصود کا ہر درجہ ظاہراً مقصود ہوتا ہے۔ ہم کو تو ظاہر میں یہی معلوم ہوتا ہے مگر حضور ﷺ نے اس علم عظیم کو ظاہر فرمایا ہے کہ مقصود کے لئے بھی یہ ضروری نہیں کہ اسکا ہر درجہ مقصود ہو بلکہ مقاصد بھی ایک خاص حد تک مطلوب ہیں چنانچہ خشیت کے بارے میں آپ فرماتے ہیں (واسئلك من خشيتك ما تحول به بيني و بين معاصيك) اے اللہ میں آپ کا خوف اتنا چاہتا ہوں جس سے مجھ میں اور معاصی میں رکاوٹ ہوجائے اس سے زیادہ خشیت کو آپ نے طلب نہیں کیا معلوم ہوا کہ اس کا زیادہ غلبہ مقصود نہیں وجہ یہ ہے کہ غلبہ خشیت سے بعض دفعہ جسمانی تکالیف کھڑی ہوجاتی ہیں جسم حزن وغم سے گھلنے لگتا ہے نیز بعض دفعہ حدود

(۱) خوف خدا کے غالب ہونے کی وجہ سے آیت میں مذکور لفظ ''ما'' بمعنی جو کو عام سمجھے کہ ہر وسوسہ پر شاید مواخذہ ہو (۲) پسندیدہ اور مقصود ہے۔

سے تجاوز ہوجاتا ہے۔ جیسے کسی غلام پر آقا کا خوف بہت غالب ہو تو اس کے سامنے جاتے ہی اس کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں پھر چاہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے زبان سے بھی بے تکی باتیں نکلتی ہیں کہنا کچھ چاہتا ہے اور زبان سے کچھ کا کچھ نکلتا ہے۔ نیز بعض دفعہ اس غلبۂ خشیت سے مایوسی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اس لئے ایسا غلبہ کمال نہیں اور اس لئے کاملین پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا چنانچہ انبیاء علیہم السلام غالب علی الکیفیات (۱) ہوتے تھے مغلوب نہ ہوتے تھے ہاں گاہے (۲) کاملین پر بھی غلبہ ہوتا ہے مگر وہ زیادہ دیر تک نہیں رہتا تھوڑی دیر کو ہوتا ہے پھر حق تعالیٰ جلدی ہی خود سنبھال لیتے ہیں اور واقعی ناقص کی سنبھال تو کاملین کے ذریعہ سے ہوجاتی ہے کاملین کی سنبھال کون کرے سوا خدا تعالیٰ کے، بس ان کو خود ہی سنبھالتے ہیں ؎

او بدلہا ہم نماید خویش را او بدوزد خرقۂ درویش را

یعنی حق تعالیٰ ہی خود اپنے کو عشاق کے سامنے ظاہر بھی فرماتے ہیں اور خود ہی ان کے نقص کو بھی کمال سے مبدل فرماتے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش آمدہ شبہ کا جواب

غرض صحابہ کو غلبۂ خشیت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ کیا وساوس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہ نے اس شبہ کو عرض کیا حضور نے بھی آیت کی تفسیر خود نہیں فرمائی کیونکہ آپ پر غلبۂ ادب تھا ادھر وحی قطعی سے رفع اشتباہ کی امید تھی احکام کے مدارج مختلف ہیں بعض کی تفسیر تو حضور نے خود فرمادی ہے اور بعض کے لئے آپ وحی قطعی کے منتظر ہوا کرتے تھے اور ان مدارج کو آپ ہی جانتے تھے غرض آپ نے خود تفسیر نہ کی کہ ما فی انفسکم سے امور اختیاریہ قلبیہ مراد ہیں۔ بلکہ فرمایا ﴿ وَقَالُوْا سَمِعْنَا

(۱) انبیاء علیہ السلام کیفیات پر غالب ہوتے ہیں (۲) کبھی۔

وَاَطَعۡنَا ۖ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ﴾یعنی ﴿ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ﴾ کہواور جو کچھ بھی حکم نازل ہو اس کو قبول کرو چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا ہی کیا اور عموم پر بھی راضی ہو گئے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کی مدح میں آیات نازل ہوئیں اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَا اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کے احکام منزلہ من اللہ پر بڑا کامل ایمان ہے کہ ہر حکم پر دل سے راضی ہو جاتے ہیں اور ﴿سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا﴾ کہتے ہیں اس کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر فرمائی: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ ﴾ یعنی حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بناتے اور وساوس غیر اختیاری ہیں تو ان پر مواخذہ نہ ہوگا اس آیت سے پہلی آیت کی تفسیر ہوگئی کہ اسمیں مَا فِی اَنۡفُسِكُمۡ سے عزم وارادہ مراد ہے جو ماکتسبت واکتسبت میں داخل ہے نہ کہ وسوسہ رہا یہ کہ احادیث میں تو یہ آتا ہے کہ دوسری آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا اور تمہاری تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان تبدیل نہیں بلکہ بیان تفسیر ہے اس کا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے خوب دیا ہے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ عام ہے وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ ہی سے تعبیر کر دیتے ہیں واقعی یہ بہت قیمتی تحقیق ہے اور جو شخص احادیث میں غور کرے گا اس کو اس کی قدر معلوم ہوگی اور تتبع سے اس تحقیق کی صحت معلوم ہو جائیگی۔اب بحمداللہ سب اشکالات رفع ہو گئے۔

شبہ کا ازالہ

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ممکن ہے آیت ﴿وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ﴾ نزولاً موخر ہو اور﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ مقدم ہو تو مؤخر مقدم کے لئے ناسخ ہو جائیگا اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تاریخ دیکھو علماء مفسرین نے تصریح کی ہے کہ سورہ ق پوری مکی ہے اور سورۂ بقر مدنی ہے دوسرے سورۂ ق کی یہ آیت مواخذہ علی

الوساوس پر دلالت کرنے میں صریح نہیں بلکہ اس میں محض علم بالوساوس کا ذکر ہے اور سورۂ بقر کی آیت عدم مواخذہ میں صریح ہے اور غیر صریح صریح کے لئے ناسخ نہیں ہوسکتا۔ کلام بہت بڑھ گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ نماز میں اگر خود بخود وساوس آویں تو وہ ذرا مضر نہیں (۱) ہاں ارادہ سے لانا بُرا ہے اور بلا ارادہ کے آئیں تو آئیں تم پروا نہ کرو۔ اب جس شخص کو یہ مطلوب حاصل ہو اس کا پھر یہ شکایت کرنا کہ ہائے مجھے وساوس بہت آتے ہیں اس کی دلیل ہے کہ وہ مقصود کا طالب نہیں کسی اور چیز کا طالب ہے اور وہ وہی ہے حظِ نفس۔ (۲) کیونکہ اگر وساوس بالکل نہ آئیں اور محویت کی سی حالت ہوجائے تو اس میں لذت خوب آتی ہے اور نفس کو کشاکشی سے نجات رہتی ہے (۳) اس حظ نفس کی وجہ سے یہ شخص لذت ومحویت کا طالب ہے گو اس کو نہ دنیا مقصود ہے نہ جاہ (۴) وغیرہ۔ لیکن ایک غیر مقصود کا تو طالب ہے اور اب تک حظوظ میں پڑا ہوا ہے۔

طلبائے فارغین کے علوم کا حال

اور میں اسی کو بیان کررہا تھا کہ جو طلبہ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد ذکر وشغل میں مشغول ہوتے ہیں ان میں دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو غیر مخلص ہیں جو جاہ وغیرہ کے طالب ہیں اور بعض مخلص ہیں مگر مخلصین بھی حظوظ (۵) میں مبتلا ہیں گو وہ حظوظ دنیویہ نہ ہوں لیکن ہیں غیر مقصود۔ اور جو طلبہ غیر مخلص ہیں ان کا تو پوچھنا کیا یہ تو انکا ذکر تھا جو خوش استعداد نہیں کہ وہ زیادہ تر اپنی بداستعدادی ہی کی وجہ سے ذکر وشغل میں مشغول ہوتے ہیں اور زیادت فی العلم سے کنارہ کشی کرلیتے ہیں (۶) اور جو خوش استعداد ہیں (۷) ان کی انتہا یہ ہے کہ وہ پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوجاتے ہیں اور

(۱) نقصان دہ (۲) نفسانی لذت (۳) نفس کھینچا تانی سے بچا رہتا ہے (۴) نہ دنیا مقصود ہے نہ اقتدار (۵) لذتوں میں گرفتار ہیں (۶) علم ہی ترقی کی کوشش نہیں کرتے (۷) جن کی تعلیمی استعداد اچھی ہے۔

وہ اسی کو ضروری سمجھتے ہیں ان کی زیادت اسی میں منحصر ہے کہ درسیات ہی ساری عمر پڑھاتے رہیں پھر ان میں بھی بعض کا مقصود تو محض تنخواہ ہے اور بعض کا مقصود یہ ہے کہ ہم کو تعلیم علم کا ثواب ملے گو اس کے ساتھ تنخواہ بھی ملتی رہے کیونکہ ہر تنخواہ اجرت نہیں بلکہ بعض تنخواہ حق احتباس (۱) بھی ہوتی ہے جیسے بیوی کا نفقہ اور رزق القاضی وغیرہ (۲) ہاں اجرت اور نفقہ میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ تنخواہ میں تعین ہوتا ہے اور نفقہ میں تعین نہیں ہوتا (۳) بلکہ اس میں قدر ضرورت کا استحقاق ہوتا ہے زیادہ کا استحقاق نہیں ہوتا مگر کبھی نفقہ زوجہ میں بھی فرض جائز ہے (۴) تاکہ نزاع نہ ہو اور جانبین کے مصالح محفوظ رہیں (۵) اس تعین سے وہ نفقہ ہونے سے نہیں نکل جاتا چنانچہ نفقہ زوجہ فرض قاضی کے بعد بھی نفقہ ہی رہتا ہے اسی طرح اگر مدرسین کی تنخواہ معین ہو تو محض تعلیم سے وہ تنخواہ اجرت تعلیم نہ ہوگی بلکہ حق احتباس اور نفقہ میں داخل رہے گی مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تنخواہ تو اجرت ہے اور کس کی تنخواہ نفقہ ہے کیونکہ محض الفاظ کو سنکر دعویٰ کر لینا اور اپنی تنخواہ کو نفقہ میں داخل کر لینا تو آسان ہے مگر حقیقت کا مصداق بننا آسان نہیں ؎

وجائزة دعوى المحبة فى الهوىٰ ولكن لا يخفى كلام المنافق

زبان سے تو دعویٰ محبت ہر ایک کو آسان ہے مگر سچ مچ عاشق ہونا بہت مشکل ہے

خوب کہا ہے:

وقوم يدعون وصال ليلىٰ وليلىٰ لا تقربهم بذاك

بہت لوگ لیلےٰ کے وصال کا دعویٰ کرتے ہیں مگر لیلیٰ ان کو منہ بھی نہیں لگاتی

(۱) تنخواہ اس پڑھانے کا عوض نہیں بلکہ جتنا وقت اس کا اس کام میں صرف ہوا اس وقت کا عوض ہے (۲) جیسے بیوی کا خرچہ اور قاضی کی تنخواہ وغیرہ (۳) تنخواہ متعین ہوتی ہے اور نفقہ متعین نہیں ہوتا (۴) کبھی بیوی کا نفقہ (خرچ) متعین کر کے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ جھگڑا نہ ہو (۵) تاکہ میاں بیوی دونوں کی مصلحتوں کا خیال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح بہت لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم واصل ہیں اور مقرب خداوندی ہیں اور خدا تعالیٰ ان کو پوچھتے بھی نہیں (کہ یہ کس کھیت کے بتھوے ہیں ۱۲)۔(۱)

نسبت کی حقیقت

بہت لوگ اپنے کو صاحب نسبت سمجھتے ہیں حالانکہ وہ دھوکہ میں ہیں وہ محض ملکہ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت ذہول (۲) نہ ہو مگر یہ غلط ہے ذہول نہ ہونا تو مشق پر موقوف ہے (۳) ایک فاسق بھی اگر دو سال خدا کے نام کی مشق کرلے تو اس کو یاداشت حاصل ہوسکتی ہے تو کیا وہ صاحب نسبت ہوجائیگا ہرگز نہیں کیونکہ فسق کے ساتھ نسبت خاصہ کا اجتماع نہیں ہوسکتا۔ یاد رکھو یاداشت عین نسبت نہیں بلکہ معین نسبت ہے کہ اطاعت وامتثال اوامر (۴) کے ساتھ یادداشت بھی جمع ہوجائے تو بہت جلد نسبت قلب میں فائض ہوجاتی ہے اب نسبت کی حقیقت سمجھو اس کی حقیقت وہی ہے، جو آپ نے درسی کتابوں میں پڑھی ہے یعنی علاقۂ معنویہ بین الطرفین (۵) نسبت ایک لگاؤ اور تعلق کا نام ہے جو دونوں طرف سے ہوتا ہے کہ بندہ کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو اور خدا تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو۔ اب ان صوفی صاحب کی نسبت کا جو کہ محض ملکہ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں یہ حال ہے کہ ان کو تو خدا تعالیٰ سے ذکر کا تعلق ہے مگر خدا تعالیٰ کو ان سے تعلق نہیں ہے۔

صوفیاء کا اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے کی مثال

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے کسی طالب علم سے پوچھا تھا کہ آج کل کس شغل میں (۶) ہو؟ کہا شاہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں پوچھا کیا کچھ

(۱) یعنی ان کی کو اہمیت نہیں ہے (۲) یادالٰہی سے کسی وقت غافل نہ ہو (۳) غفلت نہ ہونے کا مدار مشق پر ہے (۴) فرمانبرداری اور حکم کی بجا آوری (۵) ہر ایک کو ایک دوسرے سے تعلق ہونا (۶) کس کام میں مشغول ہو۔

اسکا سامان ہوگیا کہا ہاں آدھا سامان تو ہوگیا آدھا باقی ہے پوچھا یہ کیونکر کہا نکاح طرفین سے ہوتا ہے تو میں تو راضی ہوں۔ مگر وہ راضی نہیں اس لئے آدھا سامان ہے۔ اس حکایت پر سب ہنستے ہیں اور اس طالب علم کو احمق بناتے ہیں کہ بیہودہ یہ بھی کوئی سامان ہے کہ میں راضی ہوں مگر اس سے زیادہ ان صوفی صاحب کی حالت پر محقق کو ہنسی آتی ہے کیونکہ طالب علم نے تو اپنی رضا کو آدھا ہی سامان کہا تھا اور یہ حضرت اپنی یادداشت کو پورا سامان سمجھتے ہیں اور اسی پر اکتفا کر کے نازاں ہیں کہ ہم صاحب نسبت ہیں ان کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص محض اپنی رضا سے یہ سمجھنے لگے کہ میرا نکاح ہوگیا اور میں بیوی والا ہوں یاد رکھو خدا تعالیٰ کو بندہ سے تعلق جس کی حقیقت رضا ہے محض ذکر کی مشق سے نہیں ہوتا بلکہ ذکر و طاعت (۱) دونوں کے مجتمع ہونے سے ان کو وہ تعلق ہوتا ہے۔

ذاکر کون؟

اور اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ حق تعالیٰ کو ذکر ہی سے بندہ کے ساتھ تعلق ہوجاتا ہے تو پھر یہ تسلیم نہیں کہ ذکر محض اسکا نام ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کرلیا جائے یا اشغال و مراقبات کرلیے جائیں بلکہ ذکر نام ہے اطاعت کا جس میں یہ ذکر لسانی بھی داخل ہے کیونکہ فاذکرونی کا ایک فرد یہ بھی ہے اس لئے حصن حصین میں ہے کل مطیع اللہ فھو ذاکرٌ کہ ذکر تسبیح و تحمید و تہلیل ہی (۲) میں منحصر نہیں بلکہ جو شخص جس کام میں بھی حق تعالیٰ کی اطاعت بجا لا رہا ہو وہ اس وقت ذاکر ہے اور اس لئے مفسرین نے فاذکرونی اذکرکم کی تفسیر میں فرمایا ہے اذکرونی بالطاعۃ اذکرکم بالاجر والرحمۃ (۳) جب یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ جو شخص ملکہ

(۱) ذکر اور احکام کی پابندی کرنے سے (۲) اللہ کی فرمانبرداری کرنے والا ہر شخص ذاکر سے ذکر سبحان اللہ، الحمدللہ، اور لا الہ الا اللہ پڑھنے ہی میں منحصر نہیں (۳) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھونگا کہ تفسیر میں مفسرین نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ تم مجھے بذریعہ عبادت و طاعت یاد رکھو میں تمہیں اجر و رحمت سے یاد رکھوں گا۔

یادداشت کر کے احکام و اوامر میں کوتاہی کرتا ہے اس نے ذکر کی بھی تکمیل نہیں کی کیونکہ ذکر نام ہے طاعت کا اور یہ مطیع نہیں اور اگر اسی کو ذکر تکمیل کہا جائے جیسا کہ آج کل کی اصطلاح تو پھر میں یہ کہوں گا کہ محض تکمیل ذکر سے حق تعالیٰ کو بندہ کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے اطاعت کی بھی ضرورت ہے جو یہاں مفقود ہے اس لئے حق تعالیٰ کو اس سے تعلق نہیں اور جب ان کو تعلق نہیں تو نسبت بھی حاصل نہیں کیونکہ وہ تعلق من الطرفین کا نام ہے (۱)۔

اجرت اور نفقہ میں فرق کا معیار

تو جیسے اپنے کو واصل کہہ دینا زبان سے تو آسان ہے مگر حقیقت میں واصل ہونا بڑی دشوار و نادر چیز ہے۔ اسی طرح زبان سے یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہم تنخواہ نہیں لیتے بلکہ نفقہ لیتے ہیں مگر اس کی حقیقت کا مصداق بننا آسان نہیں اس کے لئے کسی حقیقت شناس کو اپنی نبض دکھاؤ (۲) اگر وہ کہہ دے کہ واقعی تمہاری تنخواہ نفقہ ہے تو پھر آپ کی حالت مبارک ہے اسی طرح ملکہ یادداشت والوں کو چاہیئے کہ کسی محقق کے سامنے اپنی حالت پیش کریں اگر وہ کہہ دے کہ تم واصل ہوگئے ہو تو پھر اس نعمت کا شکر کرو ورنہ محض اپنے علم پر اعتماد نہ کرو اور نہ دو چار جاہلوں کے بزرگ سمجھنے اور بزرگ کہنے سے دھوکہ کھاؤ صائب نے خوب کہا ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرِ چند

''اپنے گوہر کو کسی صاحب نظر کے سامنے پیش کرو کہ یہ واقعی گوہر ہے یا کانچ کا ٹکڑا ہے کیونکہ چند گدھوں کے کہنے سے تم عیسیٰ نہیں بن سکتے''

تنخواہ تعلیم کے متعلق ایک معیار میرے ذہن میں ہے اس کو عرض کرتا

(۱) دونوں طرف سے تعلق ہونے کا نام ہے (۲) کسی ایسے بزرگ سے اپنا حال بیان کرو جو حقائق سے واقف ہو۔

ہوں اگر کسی کے ذہن میں کوئی اور معیار ہو تو بہت اچھا وہ اپنے معیار سے اجرت اور نفقہ میں فرق کر لیں خدا تعالیٰ سے معاملہ ہے اس میں گفتگو اور بحث فضول ہے۔ میرے نزدیک اجرت اور نفقہ میں فرق کا معیار یہ ہے کہ جو مدرس تنخواہ لیکر پڑھا رہا ہے وہ یہ سوچے کہ اگر کسی جگہ سے زیادہ تنخواہ آجاوے مثلاً یہاں پچیس ۲۵ روپئے مل رہے ہیں دوسری جگہ سے پچاس پر ان کو بلایا جائے اور پچیس روپئے میں بھی انکا کام چل رہا ہے مگر کام چلنے کے یہ معنی نہیں کہ دس چھٹانک گھی روزانہ کھا سکتے ہوں اور دو روپئے گز کا کپڑا پہن سکتے ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ پچیس روپئے میں تالّم نہ ہو گو تنعم بھی نہ ہو (۱) نیز دوسری جگہ دین کا نفع بھی یہاں سے زیادہ نہ ہو پھر دیکھنا چاہیئے کہ اس حالت میں دوسری جگہ دونی تنخواہ پر جاتا ہے یا نہیں اگر نہیں جاتا ہے تو واقعی اس کی تنخواہ نفقہ ہے اور اگر چلا گیا تو اس کی تنخواہ اجرت ہے اور یہ کرایہ کا ٹٹو ہے (۲) گو گناہ اس میں بھی نہیں کیونکہ متاخرین کا فتویٰ جواز پر ہو چکا ہے مگر اس کو تعلیم و تدریس میں ثواب بھی کچھ نہیں کیونکہ اس کا مقصود محض تنخواہ ہے اس حالت میں یہ تعلیم طاعت نہیں غایت مافی الباب ایک عمل مباح ہے (۳) جس پر اجرت لینا متاخرین کے فتوے میں جائز ہے گو فی نفسہ تعلیم دین طاعت تھی مگر چونکہ اس کی نیت تعلیم دین کی نہیں بلکہ مقصود اجرت ہے اس لئے **لکل امرئ مانوی** (۴) کے قاعدہ سے یہ ثواب کا مستحق نہیں البتہ اگر ایک جگہ تنخواہ اس درجہ قلیل ہو جس میں تنگی اور کلفت سے گذر ہوتا ہو یا گذر تو ہو جاتا ہے مگر وہاں کوئی دوسری قسم کی تکلیف ہے جیسے باہمی رقابت اور تحاسد و تباغض (۵) وغیرہ یا اسی کے مثل کوئی اور کلفت ہو (۶) اس صورت میں دوسری جگہ چلا جانا مذموم نہیں (۷) کیونکہ اس کا مقصود

(۱) تکلیف سے گذر نہ ہوا گرچہ فراخی وسعت بھی نہ ہو (۲) کرایہ کا خچر ہے (۳) زیادہ سے زیادہ اس کو ایک جائز کام کہیں گے (۴) جس کام کے کرنے میں جو نیت ہو ویسا ہی اجر ہوگا (۵) آپس میں مخالفت حسد یا بغض وغیرہ ہو (۶) تکلیف (۷) برا نہیں۔

زیادہ تنخواہ نہیں بلکہ رفع تالم (۱) مقصود ہے یا ایک جگہ تنخواہ بھی قلیل ہے اور دین کا کام بھی اس کے ہاتھ سے یہاں کم ہورہا ہے اور دوسری جگہ تنخواہ بھی زیادہ ہے اور دین کا کام بھی وہاں اس کے ہاتھ زیادہ ہوگا اس صورت میں بھی دوسری جگہ جانے کا مضائقہ نہیں جبکہ مقصود یہ ہو کہ میں وہاں جا کر دین کا کام زیادہ کرونگا خدا تعالیٰ سے معاملہ ہے اس میں اپنی نیت کو دیکھ کر خود فیصلہ کرلینا چاہیئے لوگوں کے سامنے توجہیں کرکے اگر آپ نے یہ ثابت بھی کردیا کہ ہماری تنخواہ نفقہ ہے اُجرت نہیں تو خدا کے یہاں یہ توجہیں کام نہ دیں گی۔

علم میں ترقی کی ضرورت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو لوگ خوش استعداد ہیں اور وہ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم و تدریس ہی میں لگے رہتے ہیں ان میں بھی سب کا مقصود زیادت فی العلم نہیں بلکہ بعض کو تو محض تنخواہ ہی مطلوب ہوتی ہے اور بعض کا مقصود طلبہ میں شہرت ہے کہ تعلیم و تدریس میں نام ہوجائے اور عالم متبحر اور لائق مدرس مشہور ہوجائیں اور گو بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کا مقصود علمی ترقی اور زیادت فی العلم ہے مگر ایسا شخص ایک ہی نکلے گا دس جماعتوں میں سے اور نادر کالعدم ہوتا ہے (۲) اس لئے میرا مضمون پھر بھی قابل اہتمام کے رہا جس میں شکایت کررہا ہوں کہ ہم لوگ زیادت فی العلم کو مطلوب نہیں سمجھتے اس لئے اس کے طالب بہت تھوڑے ہیں اور پھر یہ قلیل افراد بھی طالب زیادت فی العلم محض صورت کے اعتبار سے ہیں یعنی یہ صورت علم میں زیادت کے طالب ہیں حقیقت علم میں زیادت کے یہ بھی طالب نہیں کیونکہ حقیقت علم سے تو عموماً اذہان ہی خالی ہیں پھر اس کے طالب کیونکر ہوں۔ اب میں حقیقت علم اول

(۱) بلکہ اس تکلیف کا دور کرنا مقصود ہے (۲) جس چیز کا وقوع بہت کم ہو وہ ایسی ہے کہ گویا نہیں ہے۔

تعیین کردوں پھر آیت کو اس پر منطبق کردوں گا کہ اس سے حقیقت علم میں زیادت کا مطلوب ہونا کس طرح مفہوم ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے میں اجمالاً زیادت فی العلم کے مقصود ہونے کی دلیل بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ سوۂ طٰہٰ میں فرماتے ہیں: وَقُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا اس میں رسول اللہ ﷺ کو امر ہے کہ آپ زیادت فی العلم کے لئے ہم سے دعا کیجئے جب حضور کو اس کے لئے دعا کا امر ہے تو اس سے زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا یقیناً ثابت ہوگیا اور ظاہر ہے کہ حضور کا علم سب سے بڑھا ہوا ہے جب آپ کو بھی طلب زیادت کا امر ہے تو ہم جیسوں کو تو کیوں نہ ہوگا جن کا علم حضور کے علم سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتا۔ اب میں ان آیات سے بھی جن کی میں نے تلاوت کی ہے اس مضمون کو ثابت کرنا چاہتا ہوں۔

ہدایت اور علم میں تعلق

مگر پہلے ایک مقدمہ سمجھنا چاہیئے کہ ہدایت اور علم میں کیا تعلق ہے آیا جو حقیقت علم کی ہے وہی ہدایت کی ہے یا علم ہدایت کا غیر ہے ہدایت کے معنی طلبہ کو خوب معلوم ہیں کہ اس کے معنی اراءۃ الطریق ہیں (۱) اور بعض نے اس کو ارائۃ وایصال الی المطلوب (۲) میں مشترک بھی کہا ہے مگر بہت سے محققین کی رائے یہ ہے کہ ہدایت ارائۃ اور ایصال میں مشترک نہیں بلکہ ایصال بھی ارائۃ ہی کا ایک فرد ہے پس یوں کہنا چاہیئے کہ ہدایت کے معنی اراءۃ الطریق ہی ہیں مگر ارائۃ کی دو صورتیں ہیں ایک ارائۃ من بعید دوسرے ارائۃ من قریب اور ارائۃ من قریب کو ایصال کہتے ہیں (۳) اس کے بعد سمجھئے کہ ارائۃ افعال ہے رؤیت کا اور طلبہ کو معلوم

(۱) راستہ دکھانا ہیں (۲) راستہ دکھانا اور مطلوب تک پہنچانے میں مشترک کہا ہے (۳) راستہ دکھانے کی دو صورتیں ہیں ایک دور سے راستہ دکھانا ور ایک قریب سے اور اسی کو ایصال کہتے ہیں۔

ہے کہ رؤیت کی دو قسمیں ہیں رؤیت بصر اور رویت قلب (۱) اگر ہدایت حسی ہے تو اراءۃ سے رؤیت بصر مراد ہے اور ہدایت معنوی ہے تو رؤیت قلب مراد ہے اور ردیت قلب علم ہے (۲) پس ہدایت کا حاصل علم کے قریب ہے کیونکہ ہدایت معنوی علم کو مستلزم ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ہدایت اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اور قرآن کی ہدایت حسی نہیں بلکہ معنوی ہے پس یہ ہدایت تو یقیناً علم سے متوافق اور متقارب (۳) ہے تو اگر قرآن میں کسی جگہ سے زیادت فی الھدیٰ کا مطلوب ہونا معلوم ہوگا اس سے زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا بھی ثابت ہوگا (۴)۔

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کے معنی

اب سمجھئے کہ ان آیات میں زیادت فی الہدی کی مطلوبیت کا ذکر ہے۔ حق تعالیٰ قرآن کی صفت میں فرماتے ہیں ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ اس پر یہ اشکال مشہور ہے کہ متقین تو خود ہی ہدایت یافتہ ہیں ان کے لئے ہدایت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ متقین میں تاویل کرو کہ اس سے مراد متقی بالفعل نہیں ہیں بلکہ صائرین الی التقویٰ مراد ہیں (۵) جن کو باعتبار مایؤل الیه کے متقی کہہ دیا گیا مگر حقیقت ممکن ہوتے ہوئے مجاز لینا خلاف اصل ہے اس لئے راجح توجیہ یہ ہے کہ لفظ متقین اپنی معنی پر رہے اور ہدی میں درجات نکالے جائیں کہ ہدایت کے لئے مدارج مختلفہ ہیں (۶) جن میں سے بعض مدارج کا حصول ان لوگوں کو بھی نہیں ہے جو بالفعل متقی ہیں

(۱) آنکھ سے دیکھنا اور دل سے دیکھنا (۲) اگر ہدایت حسی ہے تو اس سے آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور ہدایت معنوی ہے تو دل سے دیکھنا مراد ہے۔ اور دل سے دیکھنا ہی علم ہے۔ پس ہدایت کے معنی بھی علم کے قریب قریب ہی ہیں (۳) پس ہدایت تو یقیناً علم کے موافق اور اس کے قریب تر ہے (۴) قرآن پاک میں جہاں ہدایت کی زیادتی مطلوب ہوگی تو اس لازم آتا ہے کہ علم کی زیادتی بھی مطلوب ہے (۵) اس سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں کہ جو فی الحال متقی ہیں بلکہ مراد وہ ہیں جو تقویٰ کی راہ پر گامزن ہیں جن کو انجام کے اعتبار سے متقی کہا گیا ہے (۶) باعتبارِ انجام ہدایت کے مختلف درجات ہیں۔

قرآن اُن مدارج کی طرف متقیوں کو پہنچاتا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ ہدایت کے مدارج بہت ہیں رہا یہ کہ زیادت فی الہدیٰ مطلوب ہے اس کی دلیل سورۂ بقرہ کو سورۂ فاتحہ کی آیت ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ ہے جس میں طلب ہدایت کا امر اور سورۂ فاتحہ سے ربط بھی ہے کہ اس میں دعائے ہدایت تھی اور اس میں اجابت دعا ہے کہ لو یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ پر بھی یہی اشکال عود کرتا ہے کہ وہ لوگ تو پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں جن کو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے اس کا بھی یہی جواب ہے کہ مراد زیادت فی الہدی کی طلب ہے [1] اب هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ پر کوئی اشکال نہ رہا کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اور کتابیں تو اَن پڑھوں کو پڑھاتی ہیں اور یہ کتاب پڑھے ہوؤں کو پڑھانے والی ہیں یہ ہدایت یافتوں کے لئے ہدایت ہے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہدایت اور علم متقارب ہیں اور یہاں سے زیادت فی الھدی کا مطلوب ہونا ثابت ہے تو زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

اشکالات کے جوابات

یہ مضمون میں دوسری آیات سے بھی بیان کرسکتا تھا مگر مجھے زیادت فی العلم کے اسباب بھی بیان کرنا ہیں جس سے طلبہ غافل ہیں ورنہ وہ اُن اسباب کو ضرور اختیار کرتے۔ نیز مجھے علم اور زیادت فی العلم کی حقیقت بھی بتلانا ہے اور یہ مضامین ان آیات میں مجتمعاً مذکور ہیں (۲) اس لئے ان کو تلاوت میں اختیار کیا چونکہ مخاطب اہل علم ہیں اس لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ان کی لئے اختصار بھی کافی ہے پس میں مختصر طور پر حقیقت علم اور حقیقت زیادت فی العلم اور اس کے اسباب کو عرض کرتا ہوں [3] اور

(۱) ہدایت میں زیادتی کو طلب کرنا مراد ہے (۲) اکٹھے ذکر کئے گئے ہیں (۳) علم کی حقیقت اس میں زیادتی کی حقیقت اور اس کے اسباب کو عرض کرتا ہوں۔

اس کے لئے شروع سے آیات کا ترجمہ کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: الٓمّٓ اس کے معنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں کسی اور کو معلوم نہیں شاید حضور ﷺ کو بتلا دیئے گئے ہوں ان کے معانی تفتیش (۱) نہ کرنا چاہیے شاید تم یہ کہو تو زیادت علم کے منافی ہے جس کی تم ترغیب دے رہے ہو پس اول ان کے معنی بتلاؤ پھر زیادت فی العلم کی ترغیب دینا خصوصاً جبکہ تم کو اسباب زیادت علم بھی معلوم ہیں جن کو اس وقت بتلانے کا وعدہ کیا گیا ہے اور اگر باوجود علم اسباب کے بھی تم کو ان کے معنی معلوم نہیں تو امام مقتدی دونوں برابر ہیں کہ دونوں زیادت فی العلم میں کوتاہی کررہے ہیں اس شبہ کا جواب دینے میں چونکہ اپنے لئے زیادت فی العلم کا اثبات ہے اس لئے بہتر تو یہ تھا کہ میں جواب سے جی چراتا لیکن جواب نہ دینے میں یہ احتمال ہے کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ ان کے معنی معلوم تو ہیں مگر کسی مصلحت سے بیان نہیں کرتا اس واسطے میں جواب دینے پر مجبور ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ مجھے بھی ان کے معنی معلوم نہیں اور اس میں میں اور آپ دونوں برابر ہیں رہا یہ شبہ کہ معلوم نہیں تو تلاش کرو اور تلاش نہ کرنا زیادت فی العلم کے منافی ہے اسکا جواب یہ ہے کہ زیادت فی العلم میں ایک تفصیل ہے جس کی طرف اسی جزو میں اشارہ ہے اس کو یاد رکھیئے آگے چل کر انشاء اللہ وہ تفصیل معلوم ہو جائیگی۔

''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ'' پروارد شبہ کا جواب

﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ﴾ اس کی تفصیل مجھے مقصود نہیں اس جملہ میں قرآن کی مدح ہے کہ یہ کتاب کامل ہے اس میں کوئی بات موجب خلجان (۲) نہیں۔ رہا یہ شبہ کہ کفار تو اس میں بہت شبہات نکالتے ہیں اسکا جواب ایک تو مشہور ہے کہ قرآن میں کوئی بات فی نفسہ موجب خلجان نہیں ہے اور شبہ نکالنے والوں کو جو

(۱) اس کے معنی کی تلاش اور جستجو نہیں کرنی چاہیئے (۲) اس میں کوئی شبہ نہیں۔

شبہات پیش آتے ہیں اسکا منشا قرآن کے مضامین نہیں بلکہ ان کا قصور فہم ہے (۱) اور اگر کسی اندھے کو دن میں طلوع آفتاب میں شک ہو تو اس کے شک سے طلوع آفتاب مشکوک نہیں ہو جاتا۔ اور دوسرے جواب کی طرف هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں اشارہ ہے حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ اگر کسی کو قرآن میں کوئی شک وشبہ پیش آتا ہے تو وہ شبہ اسی وقت ہے جب تک قرآن کی تعلیم پر عمل نہ کیا جائے اور اگر قرآن کی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا جائے تو سب شبہات خود بخود زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ قرآن متقین کے لئے ہدایت ہے پس اہل شبہات کو چاہیئے کہ وہ تعلیم قرآن پر عمل کرنا شروع کریں آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ عمل کے بعد معلوم ہو جائیگا کہ حقیقت میں قرآن سرتاپا ہدایت ہے۔ ہدایت ہے اس میں کوئی امر موجب خلجان نہیں ۱۲ جامع) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اس سے میرا مقصود متعلق ہے جس کی تقریر اوپر مذکور ہو چکی اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ اس آیت سے زیادت فی الہدیٰ مفہوم ہوتی ہے (۲) اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کو اس کے ساتھ ملانے سے اس زیادت کا مطلوب ہونا ثابت ہے۔

اسباب زیادت علم

اب اسباب زیادت علم اور حقیقت علم کا بیان رہ گیا سو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہی میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ قرآن ہدایت ہے متقیوں کے لئے اور یہ ابھی معلوم ہو چکا کہ یہاں نفس ہدایت مراد نہیں کیونکہ نفس ہدایت تو متقین کو پہلے سے حاصل ہے بلکہ زیادت ہدایت مراد ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ زیادت فی الہدیٰ اور زیادت فی العلم کس کو حاصل ہوتی ہے؟ متقیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی سے سبب زیادت بھی معلوم ہو گیا کہ وہ تقویٰ ہے (کیونکہ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کسی حکم کو

(۱) ان کی کم سمجھی ہے (۲) اس آیت سے سمجھ میں آتا ہے کہ ہدایت میں زیادتی مطلوب ہے۔

کسی معنی وصفی کے ساتھ متعلق کیا جاوے تو اس معنی وصفی کو حکم میں دخل ہوتا ہے(۱) جیسے ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا﴾ (۲) اور جیسے ﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ ای اعدت لهم لكفرهم ۱۲ جامع)۔

علم کی حقیقت

نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حقیقت علم کیا ہے حقیقت علم وہ ہے جو تقویٰ سے بڑھتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ تقویٰ سے صورت علم میں تو زیادت نہیں ہوتی یہ نہیں ہوسکتا کہ تقوی سے مدارک اور بیضاوی (۳) ختم ہوجائے معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور چیز ہے جو صورت علم کے علاوہ ہے جو تقویٰ ہی سے بڑھتی ہے کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو محض صورت علم میں زیادت کے طالب ہیں اور حقیقت علم سے غافل ہیں اب رہا یہ کہ وہ حقیقت علم ہے کیا چیز۔ اس کی تعیین کرنا چاہیئے تو جن لوگوں کی نظر حدیثوں پر ہے وہ اس کو جانتے ہیں بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہ سے روایت ہے بعض لوگوں نے ان کے زمانہ میں یہ مشہور کیا تھا کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو کچھ خاص علوم عطا فرمائے ہیں جو دوسروں کو نہیں بتلائے گئے۔

من گھڑت حکایت

غضب یہ کہ تصوف کی بعض کتابوں میں بھی لکھدیا ہے کہ شب معراج میں حضور ﷺ کو نوّے ہزار علوم عطا کئے گئے تھے تیس ہزار تو عام کردیئے گئے اور تیس ہزار خواص کو بتلائے گئے اور تیس ہزار خاص حضرت علیؓ کو عطا ہوئے اور اس کے متعلق ایک

(۱) جیسے مذکورہ آیت میں ہاتھ کاٹنے کو سارق اور سارقہ جو معنی وصفی ہیں چوری کرنے والے کے اس کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے تو اس چوری کرنے کو ہاتھ کاٹنے میں دخل ہے (۲) چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت اُس کا ہاتھ کاٹ دو (۳) تفسیر کی دو کتابوں کے نام ہیں۔

لمبا قصہ ہے کہ حضور ﷺ نے اول حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ اگر ہم تم کو وہ خاص علوم بتلا دیں تو تم کیا کرو گے انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں خوب عبادت کرونگا اور جہاد میں کوشش کروں گا آپ نے فرمایا تم ان کے اہل نہیں (نعوذ باللہ) پھر حضرت عمرؓ سے پوچھا انہوں نے کہا کہ میں دوسروں کو ہدایت کروں گا اور کفار پر سختی کرونگا حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی اسکے اہل نہیں پھر حضرت عثمانؓ سے پوچھا انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی جواب دیا وہ بھی اہل نہ نکلے پھر حضرت علیؓ سے پوچھا انہوں نے کہا میں مخلوق کی ستّاری کرونگا حضور ﷺ نے فرمایا ہاں تم اہل ہو پھر ان کو وہ تیس ہزار علوم عطا ہوئے۔ کسی نے خوب فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ معراج میں جو باتیں حضور ﷺ سے ہوئی تھیں کیا تم ان کو سن رہے تھے جو تم کو ان کی مقدار بھی معلوم ہوگئی ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ معراج میں حضور سے حق تعالیٰ نے کیا باتیں کی تھیں انہوں نے خوب جواب دیا۔

اکنوں کرادماغ کہ پرسدز باغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادت علم کی حقیقت

غرض حضرت علیؓ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ان کی حیات ہی میں ہوگیا تھا کہ انکو کچھ خاص علوم عطا ہوئے ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ معارف وحکم حضرت علیؓ کی زبان سے بہت ظاہر ہوتے تھے اس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا پھر بعض نے خود حضرت علیؓ سے اس کو دریافت کیا ھل خصکم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشيءٍ دون الناس کیا حضور نے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کوئی خاص چیز عطا فرمائی ہے آپ نے دو جواب دیئے ہیں ایک جواب قال لا الا ما في هذه الصحيفة فرمایا ہرگز نہیں

(۱) وہاں کس کے پاس ایسا دماغ تھا کہ باغباں سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور صباء نے کیا کیا۔

مگر صرف وہ احکام جو اس صحیفہ میں لکھے ہوئے ہیں (اس میں صدقات اور دیت کے احکام تھے جن کا خاص نہ ہونا سب کو معلوم ہے) دوسرا جواب قال ما خصنا رسول اللہ علیه وسلم الا فهما اوتیه الرجل فی القرآن یعنی ہم کو کوئی خاص عطا نہیں ہوئی مگر ایک فہم جو حق تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطا فرمادیں۔

دین کی سمجھ ہی حقیقت علم ہے

حاصل جواب کا یہ تھا کہ جو علوم مجھ سے ظاہر ہوتے ہیں ان کا منشا یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کچھ خاص علوم دوسرے مسلمانوں سے الگ بتلائے ہیں بلکہ اسکا منشا خاص فہم ہے جو حق تعالیٰ نے قرآن یعنی دین میں مجھے عطا فرمائی ہے۔ یہی ہے حقیقت علم جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اور یہی ہے وہ فقہ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: (فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد) کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ گراں ہے اس سے درسی فقہ [1] مراد نہیں کیونکہ محض کتابیں پڑھنے سے شیطان کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ وہ معرفت ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے جس سے عارف کو دین کی سمجھ بوجھ ایسی کامل ہوجاتی ہے کہ شیطان کے تمام تاروپود [2] کو توڑ دیتا ہے شیطان بعض دفعہ دنیا کو دین کی صورت میں ظاہر کرتا ہے عارف اس دھوکہ کو سمجھ کر لوگوں پر ظاہر کردیتا ہے جس سے لوگ دھوکہ سے بچ جاتے ہیں اس لئے وہ شیطان پر گراں ہے اسی علم کی فضیلت میں یہ حدیث وارد ہے: (من یرد اللّٰہ به خیرا یفقهه فی الدین) حقیقی کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صحابہ کے اَن پڑھ ہونے پر فخر فرماتے ہیں: (نحن امة امیون لا نکتب ولا نحسب) بتلایئے صحابہ نے کیا لکھا پڑھا تھا؟ کچھ بھی نہیں بلکہ بعضے تو ان میں

(۱) فقہ کی کتابیں (۲) شیطان کے سارے تانے بانے کو توڑ دیتا ہے۔

دستخط بھی نہ کر سکتے تھے اور بعض صحابہ فتاویٰ کو تابعین کے حوالہ کر دیتے تھے مگر بایںہمہ علوم(۱) میں وہ سب سے افضل تھے چنانچہ عبداللہ بن مسعود صحابہ کی شان میں فرماتے ہیں اعمقھم علما کہ امت میں سب سے بڑھ کر صحابہ کا علم عمیق ہے آخر وہ کونسا علم تھا کیا درسی اور کتابی علم تھا ہرگز نہیں بلکہ یہ علم وہی فہم قرآن تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کو عطا فرمایا تھا جس میں ان کے تقوی سے ترقی ہوتی رہتی تھی اور یہی وہ علم ہے جس کے متعلق امام شافعیؒ کا قول ہے ۔

شکوت الی وکیع سؤحفظی فاوصانی الی ترك المعاصی (۲)

آخر وہ کونسا علم ہے جس میں معاصی حائل ہیں؟ کیا وہ کتابی علم ہے ہرگز نہیں کتابی علم تو جسکا حافظہ قوی ہوگا اس کو زیادہ یاد رہیگا ایک فاسق فاجر کو بڑے سے بڑے متقی سے زیادہ قرآن حفظ ہوسکتا ہے بلکہ کافر کو بھی ممکن ہے کہ ہم سے زیادہ مسائل و احادیث یاد ہوجائیں چنانچہ بیروت میں بعضے عیسائی ہماری حدیث اور فقہ کے بڑے جاننے والے ہیں اور جرمن کے ایک مدرسہ کا حال ایک شخص نے کسی سیاح سے نقل کیا ہے کہ وہاں علوم اسلامیہ کی تعلیم ہوتی ہے کسی کمرہ کا نام دار الفقہ ہے کسی کا نام دار الحدیث ہے اور وہاں بخاری ہدایہ سب کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور پڑھنے والے پڑھانے والے سب عیسائی کافر ہیں اور وہ لوگ اختلافیات کو بہت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں کیونکہ جرمن میں کتب خانہ بڑا ہے اس میں ہماری نایاب کتابیں اسقدر ہیں کہ ہم نے ان کتابوں کا نام بھی نہیں سنا تو امام شافعیؒ کی مراد کتابی علم میں سوء حفظ کی شکایت نہیں امام وکیعؒ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے علم میں قلت حفظ کی شکایت کررہے تھے جس میں معاصی کو دخل تھا، یہی ہے حقیقت علم اور یہی وہ چیز

(۱) اس سب کے باوجود (۲) میں نے اپنے استاد وکیع سے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں کے ترک کرنے کی نصیحت فرمائی۔

ہے جس کی وجہ سے مجتہدین مجتہد ہوئے ہیں ورنہ وسعت نظر اور کثرت معلومات میں تو ممکن ہے کہ بعض مقلدین مجتہدین سے بڑھے ہوئے ہوں خوب کہا ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریکتر زموایں جاست　　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند (۱)

بس اس سے زیادہ پتہ میں اس حقیقت کا نہیں بتلا سکتا ظاہر میں تو چھوٹا سا لفظ ہے فهما اوتيه الرجل فی القرآن (۲) مگر یہ کہ وہ فہم کیا چیز ہے اور کس درجہ کی ہوتی اس کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔ بس اس کے سمجھنے کا طریقہ یہی ہے کہ تقویٰ اختیار کر کے دیکھ لو الفاظ سے کمالات حقیقہ کی تعبیر نہیں ہوسکتی ؎

پرسید کسیکہ عاشقی چیست　　　گفتم کہ چو ماشدی بدانی (۱)

ذوقیات کو سمجھنے کا طریقہ

مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ امور ذوقیہ کی حقیقت بیان سے سمجھ میں نہیں آسکتی دیکھو اگر کسی نے آم نہ کھایا ہو اور تم اُس سے آم کی تعریف کرو کہ ایسا لذیذ اور میٹھا ہوتا ہے تو وہ کہے گا گڑ جیسا ہوتا ہے تم کہو گے نہیں وہ کہیگا شکر جیسا انگور وانار جیسا تم کہو گے نہیں پھر وہ اصرار کریگا کہ بتلاؤ کیسا ہوتا ہے تم ہی کہو گے کہ بھائی ہم کو اس کے بیان پر قدرت نہیں ایک دفعہ کھا کر دیکھ لو خود معلوم ہو جائیگا اس وقت اس شخص کو تعجب ہوگا اور اس بات کا یقین نہ کریگا کہ بیان پر قدرت نہیں مگر جب کھائیگا تو

(۱) ہر چمکدار چہرے والا دل موہنے کے انداز نہیں جانتا۔ ہر وہ شخص جس کے پاس آئینہ ہو سکندر نہیں ہو جاتا۔ اس میدان میں بال سے بھی زیادہ باریک نکتے ہیں ہر وہ شخص جس نے سر منڈا لیا ہو قلندر نہیں ہو جاتا (۲) ایک سمجھ ہے جو انسان کو قرآن دانی میں عطا کی جاتی ہے (۳) کسی نے پوچھا عاشقی کیا ہے میں نے کہا جب میرے جیسے ہو جاؤ گے پتہ چل جائے گا۔

اب وہ بھی بیان پر قادر نہ ہوگا تو یہ بات کچھ کمالات حقیقیہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ محسوسات میں بھی جس چیز کا ذوق سے تعلق ہے وہ الفاظ سے بیان نہیں ہوسکتی ایک ترکی امیر کا قصہ ہے کہ اس کی مجلس میں مطرب ایک غزل پڑھ رہا تھا جس کے اشعار میں نمی دانم نمی دانم بار بار آتا تھا مثلاً ؎

گلی یا سوسنی یا سرو یا ماہی نمیدانم ازیں آشفتہ بیدل چہ می خواہی نمیدانم (۱)

وہ ترک شراب پیئے ہوئے تھا ایک دوشعر تواس نے سنا جب اس نے بار بار نمیدانم نمیدانم (۲) کا اعادہ کیا تو اسنے ایک گھونسہ مارا کہ ایں نمی دانی چہ گوئی انچہ می دانی بگو یعنی جس بات کو نہیں جانتا اس کو بار بار کیوں دہراتا ہے جو جانتا ہے وہ کہہ یہ قدر کی اس نے شعر کی۔ تو بات کیا تھی کہ اس کو شعر کا ذوق نہ تھا اگر ذوق ہوتا تو مست ہوجاتا لیکن جس کو شعر میں مزہ آتا ہے اس سے ذرا پوچھئے تو کہ شعر میں کیسا مزہ ہوتا ہے بس یہی کہیگا کہ بیان پر قدرت نہیں۔ ذوق حاصل ہونے سے پہلے تو آپ کو یقین نہ آئیگا مگر ذوق حاصل ہونے کے بعد آپ بھی یہی کہیں گے جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سارے ولی مرتے جاتے ہیں مگر برزخ کی خبر کوئی نہیں دیتا کہ وہ عالم کیسا ہے حالانکہ بعض اولیا اس درجہ کے بھی ہیں جو مرنے کے بعد خبر دے سکتے تھے اچھا ہم ضرور بتلا دیں گے جب ہم کو دفن کیا جائے تو ہماری قبر میں قلم دوات کاغذ رکھدیا جائے ہم وہاں کے حالات لکھ کر دینگے تیسرے دن ہماری قبر پر آنا کاغذ وغیرہ قبر کے اوپر ملے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تیسرے دن حسب وعدہ کاغذ دوات قلم باہر رکھا ہوا تھا اور یہ لکھا ہوا تھا کہ حقیقت تو بغیر گذرے نہیں معلوم ہوسکتی اور پتہ اس سے زیادہ کوئی

(۱) وہ کلی ہے یا پھول یا سرد کی طرح طویل کیسی ہے مجھے نہیں پتہ اس پریشاں حال عاشق سے وہ کیا چاہتی ہے مجھے نہیں معلوم (۲) میں نہیں جانتا میں نہیں جانتا کا لفظ بار بار کہا۔

نہیں دے سکتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بیان فرمادیا ہے سچ ہے ؂

آنراکہ خبرشد خبرش باز نیامد(۱)

ذوقیات کو الفاظ سے سمجھنے کا انجام

اور اگر کوئی کمالات حقیقیہ کو الفاظ سے سمجھنا اور سمجھانا بھی چاہے تو وہ ٹیڑھی کھیر کا سا قصہ ہوگا کہ ایک لڑکا ایک مادرزاد اندھے حافظ جی کے پاس آیا اور کہا حافظ جی دعوت ہے کہنے لگے کیا کھلاویگا اس نے کہا کھیر پوچھا کھیر کیسی ہوتی ہے لڑکے نے کہا سفید ہوتی ہے حافظ جی نے سفید سیاہ کو کب دیکھا تھا پوچھا سفید کسے کہتے ہیں لڑکے نے کہا جیسے بگلا پوچھا بگلا کیسا ہوتا ہے لڑکے نے ہاتھ کو موڑ کر دکھلایا کہ ایسا ہوتا ہے حافظ جی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جا میں نہیں دعوت کھاتا یہ تو میرے گلے میں اٹک جاوے گی دیکھئے چونکہ کھیر کے اوصاف ذوقی چیز تھی اس لئے الفاظ سے سمجھ میں نہ آسکی اور کہاں سے کہاں نوبت پہنچ گئی بس اسکا سیدھا جواب یہ تھا کہ حافظ جی ایک لقمہ منہ میں لیکر دیکھو خود معلوم ہوجائے گا کہ کیسی ہوتی ہے بس یہی میں کہتا ہوں کہ حقیقت علم جو تقوے سے حاصل ہوتی ہے الفاظ سے آپ اس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے پس تقویٰ اختیار کرکے دیکھ لو۔ ہاں پتہ بتلانے کے لئے اتنا کہتا ہوں کہ حقیقت علم جس کو حاصل ہوتی ہے اس کے قلب پر غیب سے وہ علوم وارد ہوتے ہیں جو کتابوں میں نہیں مل سکتے مولانا فرماتے ہیں ؂

علم چوں برتن زنی مارے شود علم چوں بردل زنی یارے شود

بینی اندر خود علوم انبیا بے کتاب و بے معید واوستا(۲)

(۱) جس کو وہاں کے حالات کا علم ہوگیا پھر خود اس ہی کی خبر نہ آئی (۲) ظاہری علم مثل سانپ کے لئے ہے اور علم باطن حقیقی دوستہے کہ جب وہ آتا ہے تو اپنے اندر علوم انبیاء کو پاتا ہے بغیر کتاب معین اور استاد کے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ علوم وہبی ہیں کسبی نہیں ہیں اس کے متعلق ایک روایت میں آیا ہے (من عمل بما علم به علمه الله مالم يعلم) (۱)

کثرت معلومات اور علم میں فرق

آج کل لوگوں نے کثرت معلومات کو علم سمجھ لیا ہے حالانکہ علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہیں مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ سے علم اور معلومات کا عجیب فرق منقول ہے ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا کہ لوگ تو حاجی صاحب (۲) کے معتقد ہوئے زہدوتقویٰ سے یا کثرت عبادت سے یا کرامات سے اور میں معتقد ہوا علم سے۔ اس پر لوگوں کو حیرت ہوئی کہ حاجی صاحب میں اتنا علم کہاں تھا جس سے مولانا معتقد ہوجائیں ظاہر میں تو حاجی صاحب سے مولانا کا علم بڑھا ہوا تھا حاجی صاحب نے تو کافیہ (۳) ہی تک پڑھا تھا مگر علم کی حالت یہ تھی کہ کافیہ پڑھنے ہی کے زمانہ میں حاجی صاحب مشکوٰۃ شریف کے درس میں بھی بیٹھ جایا کرتے تھے جو مولوی قلندر صاحب جلال آبادی کے یہاں ہوتی تھی درس کے بعد جب طلبہ میں کسی حدیث کے متعلق اختلاف ہوتا تو حاجی صاحب اسکا مطلب بیان فرماتے بعض دفعہ طلبہ حاجی صاحب سے الجھتے کہ نہیں یہ مطلب نہیں ہے اور تقریر میں آپ کو دبا لیتے (۴) کیونکہ حضرت حاجی صاحب کی عادت مناظرہ کی نہیں تھی مگر جب مولوی محمد قلندر صاحب کو اس اختلاف کی خبر ہوتی تو ہمیشہ حاجی صاحب کی بات کو صحیح بتاتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ مولانا شیخ محمد صاحب سے مثنوی کے ایک شعر میں اختلاف ہوا حاجی صاحب کے بیان کیئے ہوئے کو اس وقت تو مولانا شیخ محمد صاحب نے نہ مانا مگر ایک بار مثنوی کے درس میں وہ

(۱) جو اپنے جانے ہوئے علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ پھر اس کو وہ علم عطا فرماتے ہیں جو وہ نہیں جانتا (۲) حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (۳) کتاب کا نام ہے (۴) آپ پر غالب آجاتے۔

شعر آیا تو مولانا نے وہی مطلب بیان فرمایا حاجی صاحب حجرہ میں تھے باہر نکل کر سلام کیا مولانا نے اقرار کیا کہ واقعی میں غلطی پر تھا آخر یہ کیا بات تھی یہ وہی علم حقیقی تھا جو حاجی صاحب کو تقویٰ کی بدولت عطا ہوا تھا اسی کو مولانا محمد قاسم صاحب فرماتے تھے کہ میں علم کی وجہ سے حاجی صاحب کا معتقد ہوا ہوں لوگوں نے اس کا راز پوچھا پھر آپ نے فرمایا کہ علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہیں اور یہ فرق بیان فرمایا کہ دیکھو ایک تو ابصار ہے اور ایک مبصرات ہیں (۱) ان دونوں میں فرق ہے یعنی ایک تو وہ شخص ہے جس نے سیاحت بہت کی ہے مگر اس کی نگاہ کمزور ہے اور ایک شخص نے سیاحت تو کم کی ہے مگر نگاہ بہت تیز ہے تو جس کی نگاہ کمزور ہے اور اس نے سیاحت بہت کی ہے اس کی مبصرات تو زیادہ ہیں مگر کسی مبصر کی پوری (۲) حقیقت سے آگاہ نہیں کیونکہ اس نے کسی چیز کو اچھی طرح دیکھا ہی نہی ہر چیز کو سرسری طور پر یوں ہی دیکھا ہے اور جس کی نگاہ تیز ہے اور سیاحت زیادہ نہیں کی اس کے مبصرات (۳) گو کم ہیں مگر جس چیز کو بھی دیکھتا ہے اس کی پوری حقیقت پر مطلع ہو جاتا ہے بس یہی فرق ہے ہمارے میں اور حاجی صاحب میں کہ ہماری معلومات تو زیادہ ہیں مگر بصیرت قلب زیادہ نہیں اور حاجی صاحب کے معلومات گو قلیل ہیں مگر بصیرت قلب بہت زیادہ ہے اس لئے ان کے جتنے علوم ہیں سب صحیح ہیں وہ ہر معلوم کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور ہم حقیقت تک نہیں پہنچتے اسی فرق کو ایک دفعہ یوں بیان فرمایا کہ ہمارے ذہن میں تو اول مقدمات آتے ہیں پھر ان سے نتیجہ خود نکالتے ہیں جو کبھی صحیح ہوتا ہے کبھی غلط اور حاجی صاحب کے قلب میں اول نتائج صحیح وارد ہوتے ہیں اور مقدمات اس کے تابع ہوتے ہیں غرض جیسے کثرت مبصرات کا نام ابصار نہیں اسی طرح کثرت معلومات کا نام علم نہیں بلکہ علم یہ ہے کہ

(۱) ایک تو دیکھنا ہے اور ایک نظر آنے والی چیزیں ہیں (۲) اس نے دیکھی تو بہت سی چیزیں ہیں لیکن دیکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی کی بھی پوری حقیقت سے واقف نہیں (۳) دیکھی ہوئی چیزیں اگرچہ کم ہیں۔

ادراک سلیم اور قوی ہو جس سے نتائج صحیحہ تک جلد وصول ہو جاتا ہو یہی ہے حقیقت علم جو فقط پڑھنے پڑھانے سے حاصل نہیں ہوتی۔

حقیقت علم کے حصول کے اسباب

بلکہ اس کے اور اسباب ہیں منجملہ ان کے ایک سبب تو دعا ہے جو ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ﴾ میں مذکور ہے دوسرا سبب تقوی ہے جو هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ میں مذکور ہے اور تقوی سے یہ مراد نہیں کہ ذکر و شغل اور مراقبات کیا کرو یہ تو زینت تقوی ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت

تقوی کی حقیقت اور ہے جس کو خدا تعالیٰ ہی سے پوچھ لو حق تعالیٰ نے اسی مقام پر تقویٰ کی حقیقت بھی بیان فرمائی ہے: ﴿الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴾ (۱)

اس جگہ حق تعالیٰ نے عقائد اور عبادات بدنیہ و مالیہ (اور معاملات) (۲) کے اصول بیان فرما دیئے ہیں پس حاصل یہ ہوا کہ متقی وہ لوگ ہیں جو دین میں کامل ہوں کہ ان کے عقائد بھی صحیح ہوں اور عبادات بدنیہ و مالیہ (اور معاملات) میں بھی کوتاہی نہ

(۱) البقرہ: ۳و۴ (۲) کتب سابقہ کے ساتھ ایمان کا تذکرہ کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو معاند اور ہٹ دھرم نہ ہونا چاہیئے کہ صرف اسی چیز کو مانے جس کا تعلق اپنے سے ہے اور جس چیز کا تعلق غیر سے ہو اس کو نہ مانے بلکہ مسلمان کو منصف اور عادل ہونا چاہیئے کہ جتنی بات جس کی بھی سچی ہو اس کو مانے پس انجیل و تورات کا گو ہم سے عمل کے طور پر تعلق نہیں مگر اتنی بات تو سچی ہے کہ یہود و نصاریٰ پر یہ کتابیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں پس اس کا انکار نہ کرنا چاہیئے اور ان کو بھی منزل من اللہ ماننا چاہیئے ہاں یہود وغیرہ نے جو ان میں تحریف کی ہے اس کا انکار ضرور کیا جائے اس تعلیم میں مسلمانوں کو عدل و انصاف کی تاکید ہے کہ مخالفت میں بھی حد سے نہ بڑھیں اور یہی اصل الاصول ہے۔

کرتے ہوں اور یہی خلاصہ ہے کمال فی الدین کا مگر یہ تفسیر اس پر موقوف ہے کہ ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ الخ صفت کاشفہ ہو (۱) اور اگر صفت کاشفہ نہ بھی ہو جب بھی میرا مدعیٰ حاصل ہے کیونکہ میرا مقصود یہ ہے کہ تقویٰ زیادت علم کا سبب ہے، اب چاہے وہ تقوی اس مجموعہ کا نام ہو جو مجموعہ آیات میں مذکور ہے یا اس مجموعہ سے جو حالت بسیط پیدا ہوتی ہے (۲) اس کا نام ہو جو للمتقین کا مدلول ہے اس میں بحث کرنے کی مجھے ضرورت نہیں باقی یہ ظاہر ہے کہ تقویٰ کے لئے تمام معاصی سے اجتناب ضروری ہے (۳) اور وہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ مامورات (۴) کو بھی بجالایا جائے کیونکہ ترک مامور بہ بھی معصیت ہے (۵) اس کا ترک بھی تقویٰ کے لئے ضروری ہے اب چاہے تقویٰ کو مرکب مانو یا بسیط وجودی مانو یا عدمی اس کے لئے عقائد واعمال ومعاملات کی درستی بہرحال ضروری ہے خواہ شرطاً یا شطرا (۶) مگر ایک دوسری آیت سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ الخ صفت کاشفہ ہی ہے اور یہ سب اعمال حقیقت تقویٰ میں داخل ہیں گو لغتاً تقویٰ مفہوم عدمی ہو مگر شرعاً مفہوم عدمی نہیں ہے بلکہ شرعاً تقویٰ کی حقیقت کمال فی الدین ہے جس پر وہ دوسری آیت دال ہے وہ دوسری آیت یہ ہے ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج﴾ (۷) یہاں تک تو عقائد کا ذکر ہے اور مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں البر سے مراد بر

(۱) اسرار کو کھولنے والی صفت ہو (۲) جو کشادہ حالت (۳) تمام گناہوں سے بچنا ضروری ہے (۴) جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے (۵) اس لئے کہ جس کام کے کرنے کا حکم ہو اس کو چھوڑنا بھی گناہ ہے (۶) چاہے اس کے لئے شرط مانو یا اس کا حصہ مانو (۷) سارا کمال اسی میں نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات پر) یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر۔ البقرہ: ۱۷۷۔

کامل ہے تو بر کامل کا ایک جز و تو تصحیح عقائد ہے آگے فرماتے ہیں ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ﴾(۱) یہ حقوق مالیہ کا حسن معاشرت کا ذکر ہے وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ اس میں عبادات بدنیہ و مالیہ کا ذکر ہے ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ اس میں اصول اخلاق کا ذکر ہے غرض اعمال ظاہرہ اور طاعات مالیہ و بدنیہ اور اعمال قلبیہ وغیرہ سب اس آیت میں موجود ہیں ان سب کو بیان فرما کر ارشاد ہوتا ہے ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ اس سے صاف معلوم ہوا کہ متقی وہ ہے جو ان سب اوصاف سے متصف ہو پس ثابت ہوا کہ تقویٰ کی حقیقت کمال فی الدین ہے اور تصحیح عقائد و ادائے طاعات بدنیہ و مالیہ و اصلاح معاملات و معاشرت سب اس کے اجزاء ہیں اب (الذین یومنون بالغیب) الخ کا صفت کاشفہ ہونا بالکل صحیح ہے پس تقویٰ محض ذکر و شغل کا نام نہیں یہ تو اس کی زینت ہے بلکہ تقویٰ ان اعمال کے بجالانے کا نام ہے جو اس آیت میں مذکور ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دین میں کامل ہونے کا نام تقویٰ ہے پس ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کا حاصل یہ ہوا کہ زیادت ہدیٰ اور زیادت علم کا سبب کمال فی الدین ہے اس کا طلبہ کو بالکل اہتمام نہیں اور اس میں وہ بے حد کوتاہیاں کرتے ہیں ان کوتاہیوں کی تفصیل میں کہاں تک کروں اور کس کس بات کو بتاؤں ذرا کوئی شخص دو ہفتے کسی محقق کے پاس رہے اور اس سے اپنی اصلاح کی درخواست کرے اور وہ محقق بھی ایسا ہو

(۱) اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جبکہ عہد کرلیں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال (کفار) میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ البقرہ: ۱۷۷ معارف القرآن: ۱/۴۳۰۔

جو بے تکلف روک ٹوک کرتا ہو تب ان کو اپنی کوتاہیوں کی حقیقت معلوم ہو۔

تقویٰ کی ایک مثال

تقویٰ کی ایک ادنیٰ نظیر بتلاتا ہوں کہ لکھنو میں ایک بیرنگ کارڈ میرے نام آیا میں موجود نہ تھا میرے رفیقوں نے اُسے واپس کردیا کہ مکتوب الیہ شاید نہ لے ڈاکیے نے ان سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو اس کو پڑھ سکتے ہیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع کر سکتے ہیں تو اس کو پڑھ کر واپس کر دیجئے میرے رفیقوں نے کہا کہ یہ تو جائز نہیں کیونکہ جب ہم نے پڑھ لیا تو اس سے انتفاع ہوگیا انتفاع کے بعد واپس کرنے کا کیا حق ہے۔ بتلائیے اس وقت کارڈ کے پڑھنے سے کون چیز مانع ہوئی جبکہ ڈاکیا خود اجازت دے رہا تھا صرف خوف خدا مانع تھا اور تقویٰ خوف خدا ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

طلباء میں تقویٰ کی کمی کا سبب

طلبہ میں جو تقویٰ کی کمی ہے اسکا سبب یہی ہے کہ خدا تعالیٰ سے خوف نہیں ہے اب تو یہ حالت ہے کہ جس کام کو کرنا چاہتے ہیں اس کو گھیر گھار کر جائز کر لیتے ہیں، گو دل میں جانتے ہیں کہ ناجائز ہے۔ بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے مشائخ اور اساتذہ بہت نیک کام کرتے ہیں ہم بھی ان کے ساتھ بخشے جائیں گے قیامت میں وہ ہم کو بخشوالیں گے یہ تو وہی حالت ہے ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبَّآؤُهٗ﴾ ان کو بھی اپنے نبی زادے اور صاحب علم ہونے پر ناز تھا مگر حق تعالیٰ نے اس گھمنڈ کو بالکل باطل کردیا۔ کیا تم نے یہ حدیث نہیں سنی (ویل لمن لا یعلم ولوشاء اللہ لعلمہ واحد من الویل وویل لمن یعلم ولا یعمل سبع من الویل رص عن جبلة مرسلا ای رواہ سعید بن منصور فی سنة کذا فی العزیزی ص۴۱۷ ج۳)

(یعنی جاہل کے لئے ایک ہلاکی ہے اور عالم کے لئے سات گونہ ہلاکت ہے ۱۲)
آخر اس حدیث پر عمل کرنے کے لئے کیا کوئی دوسری مخلوق پیدا ہوگی کیا یہ تعلیمات ہمارے واسطے نہیں ہیں۔

طلباء میں موجود کوتاہیاں

ایک کوتاہی طلبہ میں یہ ہے کہ امارد (۱) کی طرف نظر کرنے اور ان کے ساتھ اختلاط کرنے سے نہیں بچتے حالانکہ یہ تقوی کے لئے سم قاتل ہے (۲) آخرت کا مواخذہ تو شدید ہے اس سے دنیا میں بھی اہل علم کی سخت بدنامی ہوتی ہے علم دین پڑھنے والوں کو اس باب میں سخت احتیاط کرنا چاہیئے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ چندہ میں احتیاط نہیں کرتے اہل وجاہت کے دباؤ سے چندے وصول کرتے ہیں۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ طلبہ میں استادوں کا ادب نہیں ہے اور جن استادوں کا ادب کرتے ہیں وہ استادی کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ بزرگی اور شہرت کی وجہ سے ہے۔ استادی کا ادب ہوتا تو جو استاد مشہور بزرگ اور مقتدا نہیں ہیں انکا بھی ادب کیا جاتا کیونکہ استادی کا حق تو ان کو بھی حاصل ہے کانپور میں ایک مدرسہ کے ایک طالب علم نے مجھ سے خود بیان کیا کہ اس سال استاد نے تو تصریح پڑھنے کی رائے دی تھی مگر میری زبان سے شرح چغمنی کا نام نکل گیا تھا بس مجھے اس کی ضد ہوگئی اور وہی شروع کر کے چھوڑی۔

اسی طرح ایک مدرسہ میں کسی کتاب کے ختم پر طلبہ واستاد کی تو یہ رائے ہوئی کہ شمس بازغہ ہونا چاہیئے ایک طالب علم کی یہ رائے ہوئی کہ نہیں صدرا ہونا چاہیئے خیر شمس بازغہ ہی منظور ہوگیا تو آپ شب کو استاد کے پاس پہنچے ان کو مکان سے باہر بلاکر

(۱) نابالغوں کو دیکھنے اور ان سے میل جول رکھنے سے احتیاط نہیں کرتے (۲) ہلاک کرنے والے زہر کی طرح ہے۔

کہتے ہیں کہ مولوی صاحب خیریت اسی میں ہے کہ صدرا ہو[(۱)] انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ بھلا اس حالت میں ان کم بختوں کو کیا علم حاصل ہوگا بس کتابیں ختم کرلیں گے مگر علم جس کا نام اس کی ہوا بھی نہ لگے گی۔

پھر حیرت یہ ہے کہ جو استاد گھر پر پڑھاتے ہیں ان کی تو کچھ قدر بھی ہوتی ہے لڑکوں کو بھی اور ماں باپ کو بھی حالانکہ ان کو خود تنخواہ دیتے ہیں اور ان مدارس کے استادوں کی تو ذرا بھی قدر نہیں حالانکہ ان کو طلبہ یا طلبہ کے والدین تنخواہ بھی نہیں دیتے جس کا زور ہو بلکہ مدرسہ سے تنخواہ ملتی ہے مگر طلبہ ان کی نافرمانی زیادہ کرتے ہیں اور مدرسین ان کو کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اندیشہ بھاگ جانے کا ہے اور طلبہ کے بھاگ جانے سے چندہ کم ہو جائیگا معلوم ہوا کہ اہل مدارس کو چندہ مقصود ہے اس لئے طلبہ کو فراہم رکھا جاتا ہے لیکن چندہ کی غایت پوچھی جائے تو طلبہ کو امداد واعانت کا نام لیا جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دَور کیسا ہے کہ چندہ سے مقصود طلبہ ہیں اور طلبہ سے مقصود چندہ ہے اسی لئے طلبہ مدارس کے استادوں کی قدر نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مدرسہ کا بقاء ہمارے ہی وجود سے ہے اگر ہم نہ ہونگے تو مدرسہ بھی نہ ہوگا اس لئے وہ جس طرح چاہیں استادوں کو نچاتے ہیں مگر یادرکھو اس طرح علم نہیں حاصل ہوگا یہ دولت ادب سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور اساتذہ کا ادب

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے کسی نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے تفوق علمی کا سبب پوچھا تھا تو میرے سامنے فرمایا کہ مولانا کے اس تفوق علوم کے بہت سے اسباب ہیں منجملہ ان کے ایک سبب یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ اپنے استادوں کا ادب بہت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تھانہ بھون کا ایک گندھی[(۲)] مولانا سے

(۱) گویا دھمکی دی کہ جو کتاب میں کہہ رہا ہوں وہی پڑھایئے (۲) گندا اٹھانے والا۔

ملنے کو گیا اور کہا میں تھانہ بھون کا رہنے والا ہوں بس یہ سن کر مولانا پر بے حد اثر ہوا اس کی خاطر و مدارت میں بچھے جاتے تھے محض اس لئے کہ وہ تھانہ بھون کا رہنے والا تھا جو وطن ہے اپنے مرشد کا۔ افسوس ہے کہ یہ حضرات تو اپنے اکابر کے جاہل ہموطنوں کا اتنا ادب کرتے تھے اور آجکل خود اکابر کا بھی ادب نہیں کیا جاتا۔

علماء کا ادب کرنے کی اہمیت

صاحبو علماء کا ادب بہت ضروری ہے حدیث میں ہے من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا (ولم یبجل عالمنا) فلیس منا۔ یعنی جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑے کی تعظیم نہ کرے (اور عالم کا ادب نہ کرے) وہ ہم میں سے نہیں ہے یہ کس قدر سخت وعید ہے مگر افسوس طلبہ اس پر عمل نہیں کرتے پھر علاوہ اس کے کہ یہ اساتذہ عالم ہیں اور بڑے ہیں ان کا ادب اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ وارثان رسول ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ اور ﴿وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ اور ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ اور ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ﴾

یعنی رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش قدمی نہ کرو، اور آپ کے سامنے زور سے (چلا چلا کر) باتیں نہ کرو، اور رسول کو اس طرح نہ پکارو جیسا آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہو (بلکہ ادب سے بات کرو) اور جب آپ کے پاس مجمع میں بیٹھے ہوئے ہو تو بدون اجازت کے وہاں سے نہ اٹھو۔ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کے جو حقوق بیان کئے گئے ہیں حضور ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء اور وارثان علم کے بھی وہی حقوق ہیں کیونکہ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں بلکہ جس حدیث میں تبجیل (۱)

(۱) علماء کے ادب کی تاکید ہے۔

علماء کی تاکید ہے وہ ان احکام کے عموم پر دال ہے وارثان رسول کے لئے، اسی واسطے سلف نے وارثان رسول کا وہی ادب کیا ہے جو ان آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مذکور ہے بہرحال استادوں کا ادب بھی تقوی میں داخل ہے جو اس میں کوتاہی کریگا وہ متقی نہ ہوگا اور اس میں کوتاہی کا بڑا سبب یہی ہے کہ طلبہ کو تقویٰ کا اہتمام نہیں۔

حصول تقویٰ کا گُر

میں تقوی کے متعلق آپ کو ایک گُر بتلاتا ہوں اس کو یاد رکھیئے وہ یہ کہ گو نوافل اور ذکروشغل زیادہ نہ ہو مگر ورع یعنی ترک معاصی و مناہی کا زیادہ اہتمام کرو[۱] حدیث میں ہے لا تعدل بالرعة (ورع کی برابر کسی چیز کو نہ کرو۔

علوم مقصودہ وغیر مقصودہ کی تفصیل

اب میں اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں جو اثناء بیان میں کیا تھا کہ زیادت فی العلم میں تفصیل ہے وہ یہ کہ زیادت فی العلم ان علوم میں مقصود ہے جنکا اظہار کیا گیا ہے اور جن علوم کا اظہار نہیں کیا گیا ان میں یہ زیادت مقصود نہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قدر میں کلام کیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: (الهذا خلقتم ام بهذا امرتم ام بهذا ارسلت اليكم لقد هلك من كان قبلكم حين تناعوا فى القدر عزمت عليكم عزمت عليكم ان الاتنازعوا فيه [۲] رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوۃ) اب میں اس کی تعیین کرتا ہوں کہ کن علوم کا اظہار کیا گیا ہے اور کن علوم کا اظہار نہیں کیا گیا اس کا معیار یہ ہے کہ بعض علوم تو وہ ہیں جن کو قرب و بعد میں دخل ہے جیسے مامورات و منہیات ان کو تو شریعت نے ظاہر کیا

(۱) گناہوں کے ترک کرنے اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے بچنے کا زیادہ اہتمام کرو (۲) کیا تم اس لئے پیدا کیئے گئے ہو یا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے یا میں اس کے لئے تمہاری طرف مبعوث کیا گیا ہوں تم سے پہلی امتیں تقدیر کے بارے میں جھگڑنے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ میں پختگی سے تم کو منع کرتا ہوں کہ اس بارے میں مت جھگڑو۔

ہے صحابہ کو انہی میں زیادت کا اہتمام تھا حضرت حذیفہ فرماتے ہیں (کانوا یسئلون النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الخیر وکنت اسئلہ عن اللبشر مخافۃ ان اقع فیہ (او کماقال) کہ صحابہؓ تو حضور ﷺ سے خیر کی باتیں زیادہ پوچھتے تھے (جن کو قرب میں دخل تھا) اور میں آپ سے شر کے متعلق بہت سوال کرتا تھا تاکہ اس میں مبتلا نہ ہوجاؤں جس سے بعد ہو جاوے اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

عرفت الشرلا للشر لکن لتوقیہ ومن لا یعرف الشر من الخیر یقع فیہ (۱)

ان علوم میں تو زیادت مطلوب ہے۔

علوم اسرار اور علوم انوار

دوسرے وہ علوم ہیں جن کو قرب و بعد میں دخل نہیں جیسے قدر کی حقیقت معلوم کرنا (۲) پلصراط کی حقیقت معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ نماز پانچ وقت کیوں مقرر ہوئی ہے کم و بیش کیوں نہ ہوئی اس کی کچھ ضرورت نہیں نہ اس کے جاننے سے کچھ قرب میں ترقی ہے نہ عدم علم سے کچھ بُعد ہے ان علوم کو اسرار کہا جاتا ہے اور اس کے مقابل اور علوم کو جنہیں قرب و بعد میں دخل ہے انوار کہنا چاہیئے۔ یہ لقب ان کے لئے اس واسطے مناسب ہے کہ نور کی شان ظاہر فی نفسہ مظہر لغیرہ (۳) اور یہ علوم بھی ایسے ہی ہیں کہ فی نفسہ خود ظاہر ہیں اور ان پر عمل کرنے سے اسرار بھی منکشف ہونے لگتے ہیں (۴) گو انکا جاننا مقصود نہیں مگر ان کے حصول کا طریقہ یہ نہیں کہ اسرار کو بلا واسطہ طلب کیا جائے بلکہ طریقہ یہ ہے کہ علوم انوار کو حاصل کرو اور تقویٰ کے ساتھ ان پر عمل کرو پھر حق تعالیٰ خود ہی اسرار بھی قلب پر القاء کردیں گے (۵) اور ان علوم کو انوار سے ملقب کرنے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے

---

(۱) میں نے شر کو معلوم کیا اس میں مبتلا ہونے کے لئے نہیں بلکہ اس سے بچنے کے لئے کیونکہ جو خیر اور شر میں امتیاز نہیں کرسکتا وہ شر میں مبتلاء ہوجاتا ہے (۲) تقدیر کی حقیقت معلوم کرنا (۳) نور خود ظاہر ہوتا ہے دوسرے کو ظاہر کرتا ہے (۴) کھل جاتے ہیں (۵) دل میں ڈال دیں گے۔

ہیں: یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ کہ حق تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہیں ہدایت کردیتے ہیں اور دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ﴾ کہ قرآن سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے (لام بمعنی الی ہے) اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ہدایت وہی ہے جو قرآن کی ہدایت ہے تو جن امور کی طرف قرآن نے ہدایت کی ہے یعنی جن علوم کو ظاہر کردیا ہے ان کا نور ہونا ثابت ہوگیا پس الٓمٓ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اے سامعین جن علوم کی زیادت مطلوب ہے وہ وہ ہیں جو ظاہر کردیئے گئے ہیں تم ان میں زیادت طلب کرو اور اسرار کے درپے نہ ہو جس کا نمونہ یہ الم ہے اس مضمون کو سورہ آل عمران میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ط فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ج وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ م وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ لا کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے جس نے نازل کیا ہے تم پر کتاب کو جس میں ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں (یعنی ان کا مطلب ظاہر) اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں اس کتاب کا (مطلب یہ ہے کہ غیر ظاہر المعنی کو بھی انہی ظاہر المعنی کے موافق بنایا جاتا ہے) اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو مشتبہ المراد ہیں (کہ انکا مطلب خفی ہے) سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کے (غلط) مطلب ڈھونڈھنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدہ میں اس سے مدد حاصل کریں حالانکہ اسکا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا اور (اسی واسطے) جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً یقین رکھتے ہیں سب آیتیں ہماری پروردگار کی طرف سے

ہیں (ظاہر المعنی بھی خفی المعنی بھی پس ان کے جو کچھ معنی اور مراد واقع میں ہیں وہ حق ہیں) اور نصیحت (کی بات کو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں (یعنی عقل کا مقتضا بھی یہی ہے کہ مفید اور ضروری بات میں مشغول ہو مضر اور فضول قصہ میں نہ لگے (بیان القرآن)۔

علم محکم و علمِ متشابہ

اس آیت میں علوم کی تقسیم کردی گئی ایک علم محکم ایک علم متشابہ، اور یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ علوم محکمہ اصل مقصود ہیں اور علوم متشابہ کا درپے ہونا مذموم ہے پس اب زیادت فی العلم کی تفصیل بخوبی واضح ہوگئی کہ زیادت ہر علم میں مقصود نہیں بلکہ صرف محکمات میں مقصود ہے افسوس ہے کہ آجکل لوگ انہی علوم کے درپے ہیں جن کے درپے ہونے سے روک دیا گیا ہے کوئی پوچھتا ہے نماز میں کیا حکمت ہے کوئی کہتا ہے جماعت کی کیا فلاسفی ہے کوئی روزہ اور حج کی علت کے درپے ہے حالانکہ شریعت نے علل احکام کے جاننے کا امر نہیں کیا اور جن علل کو بیان بھی کیا ہے جیسے سُورِہرّہ(۱) کے باب میں فرمایا: (انھا من الطوافین علیکم والطوافات) وہ علتیں بھی اہل استنباط کے لئے بیان فرمائی ہیں تا کہ حکم کا تعدیہ کرسکیں عوام کو ان کے جاننے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ ان میں صلاحیت اجتہاد تو کیا ہوتی بعض علل کے سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں بس ان اسرار کا حق یہ ہے کہ کلٌ من عند ربنا (۲) کہہ کر اجمالا اس پر ایمان لے آؤ کہ حق تعالیٰ کے احکام میں ضرور حکمتیں ہیں گو ہم کو معلوم نہ ہو اور آیات متشابہات کے ضرور کچھ معنی ہیں گو ہم نہ جانتے ہوں اور جو اس کی مراد ہے ہم اس کو حق مانتے ہیں یہی معاملہ حروف مقطعات قرآنیہ کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں گو مضامین تو اور بھی قلب پر آرہے ہیں مگر اب رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ سامعین بھی سونے لگے ہیں میں بھی تھک گیا ہوں

(۱) بلی کے جھوٹے کے بارے میں علت بیان کی ہے کہ وہ گھروں میں چکر لگاتی رہتی ہے اس لئے ناپاک نہیں ہے

(۲) سب میرے رب کی طرف سے۔

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ سب مسلمانوں کو اور خصوصاً طلبہ کو زیادت فی العلم اور نور علم کی تحصیل کا امر ہے (۱) اس کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے دو طریقے ہیں ایک دعا۔ دوسرے تقوی عن المعاصی (۲)۔ اس مضمون سے چونکہ بہت اذہان خالی تھے، اور تھا نہایت ضروری اس لئے آج میں نے اسی کو بیان کے لئے اختیار کیا گو تفصیل زیادہ نہ ہو سکی مگر مخاطب زیادہ تر اہل علم ہیں امید ہے کہ ان کو اختصار بھی کافی ہو گیا ہوگا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

تتمہ وعظ (۳)

بعض مضامین تقریر کے وسط میں حاضر فی الذہن تھے مگر اخیر میں ذہن سے نکل گئے اور ایک مضمون بعد ہی میں ذہن میں آیا ان سب کو مفید ہونے کے سبب لکھا جاتا ہے۔ اول: (اور یہ بعد میں ذہن میں آیا) یہ علم موہوب جو تقویٰ سے مسبب ہے وہ ہے جس کی نسبت حدیث میں ارشاد ہے: (من اوتی زهدا فی الدنیا وقلة منطق فاقتربوا منه فانه یلقی الحکمة)

ثانی: (اور یہ اور اس کا ما بعد تقریر کے وسط میں ذہن میں حاضر تھا) یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ اس تقریر کی بنا پر ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقوی سبب ہے ہدیٰ مفر بزیادت فی العلم اور آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدی سبب ہے ھدیً سے درجہ علیا ہے تقوی کا جو کہ موہوب ہے تو حاصل مجموعہ نصین کا یہ ہوا کہ بندہ اول نفس تقوی جب بکسب اختیار کرتا ہے اس پر ہدیٰ مرتب ہوتا ہے پھر اس ھدیً پر ثابت رہنے سے خود اس میں بھی ترقی ہوتی ہے اور تقوی کا درجہ علیا موہو یہ بھی اس سے عطا ہوتا ہے اور قرینہ

(۱) طلباء کو علم بڑھانے اور اس کا نور حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۲) گناہوں سے احتراز (۳) کتبہا سید حکیم الامۃ بیدہ الکریمہ واعطانیہا بعد رجوعہ الی الوطن وہذا نصہ ۱۲ ظ۔

اس ارادۂ موہبت کا لفظ اتـــاهـم ہے اور قرینہ اس کے علیا ہونے پر اضافت ہے تقویٰ کی ضمیر مہتدین کی طرف جو اس کے کمال پر دال ہے جیسے وسعی لها سعیها ای السعی المناسب لها۔ اسی طرح یہاں مراد یہ ہے ای التقویٰ المناسب لشانهم وهم الکاملون فالتقوی المناسب للکاملین هوالکامل منه

ثالث: اس وعظ کا نام کوثر العلوم تجویز کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں زیادت فی العلم مفر بحکمت کا ذکر ہے اور حکمت کو حق تعالیٰ نے خیر کثیر فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ اور کوثر کی تفسیر بھی خیر کثیر سے کی گئی ہے اور اسی بنا پر نہر خاص کو بھی کوثر کہا گیا ہے کہ وہ خیر کثیر ہے بلکہ اہل معانی نے تو خود اس نہر کی حقیقت بھی علم وحکمت ہی بتلائی ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ محققین نے تصریح کی ہے کہ تمام معانی کی کچھ مثالی صورتیں بمناسبت اور اوصاف کے حق تعالیٰ نے عالم برزخ وعالم آخرت میں پیدا کی ہیں چنانچہ احادیث میں بھی بعض کا ذکر ہے سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران کا بشکل دو بدلیوں کے ظاہر ہونا اور درمیان میں جو بسم اللہ ہے اسکا بشکل ایک چمک کے ظاہر ہونا ونحو ذلک وارد ہے۔ اسی طرح شریعت کی صورت پلصراط کو کہا ہے اور علم وحکمت کی صورت حوض کوثر کو کہا ہے اور اسی مناسبت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں جو دودھ دیکھا تھا اس کی تعبیر علم سے فرمائی کیونکہ دونوں کے منافع کثیر ہیں اور حوض کوثر کا پانی بشکل دودھ کے منقول ہوا ہے۔ [1] واللہ اعلم

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

(۱) اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ میں مذکور مضامین سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۹/محرم الحرام ۱۴۳۳ھ